ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

# ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اگست ۲۰۱۷ء

www.nadwifoundationaligarh.org

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

# فہرست مضامین


| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | قرآن کا پیغام | ''جاہلیت'' اور ''اسلام'' کا فرق | حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ | |
| ۲۔ | اداریہ | تشویش ناک صورتِ حال | مدیر | ۳ |
| ۳۔ | پیام سیرت | زندگی ہے آپ پر قربان ہوجانے کا نام | محمد فرید حبیب ندوی | ۷ |
| ۴۔ | خاص تحریر | ارمانوں کا خون | ابوسعد چارولیہ | ۱۰ |
| | مناسک حج | حج سے متعلق چند مشہور کوتاہیاں | مولانا ندیم احمد انصاری | ۱۴ |
| | قرآنیات | مکمل قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر کرنے والی خواتین | محمد سراج الہدی ندوی ازہری | ۱۷ |
| | تربیت و ارشاد | صالحین کی صحبت | مولانا محمد اسرار الحق قاسمی | ۲۸ |
| | تعلیم و تربیت | نئے تعلیمی سال کا آغاز اور ارباب مدارس..... | مولانا محمد قمر الزماں ندوی | ۳۲ |
| ۶۔ | // // | تربیت اولاد- چند اہم گوشے | ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی | ۳۶ |
| ۷۔ | فتنۂ انکار حدیث | جدید منکرین حدیث | محمد فرید حبیب ندوی | ۳۹ |
| ۸۔ | فکر اسلامی | مفکر اسلام- ایک مطالعہ (قسط-۱۷) | ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی | ۳۶ |
| ۹۔ | قضیۂ فلسطین | فلسطین کا حق دار کون؟ | ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی | ۴۶ |
| ۱۲۔ | شخصیات | حضرت شیخ یونسؒ کی کہانی، خود ان کی زبانی | محمد حماد کریمی ندوی | ۵۱ |
| ۱۳۔ | تعارف و تبصرہ | حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (مشاہدات وتاثرات) | ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی | ۶۱ |
| | | حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی | // // | ۶۲ |
| ۱۴۔ | آخری صفحہ | دینی مدارس سے بے توجہی کی بنیادی وجہ | م-ق-ن | ۶۴ |
| ۱۵۔ | شعروادب | پیام | ماہر القادریؒ | |


❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

# تشویش ناک صورتِ حال

ملک میں اس وقت فسطائی طاقتیں پورے طور پر سینہ زوری کا مظاہرہ کر رہی ہیں، خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے، واقعات کی تفصیل درج کرنا تحصیل حاصل کے مرادف ہوگا، کیوں کہ سوشل میڈیا کے اس دور میں چھوٹے سے گاؤں میں ادنیٰ سا واقعہ بھی رونما ہوتا ہے تو وہ منٹوں اور سکنڈوں میں وائرل ہوکر ہر شخص تک پہنچ جاتا ہے، میری نظر میں اس کی افادیت کے بالمقابل اس کا نقصان بڑھتا جارہا ہے، متعدد واقعات اسی سوشل میڈیا کا نتیجہ ہیں، اس کے ذریعہ سالوں کا کام دنوں میں انجام دیا جارہا ہے، سیدھے سادے لوگوں کے ذہنوں میں بھی زہر گھول دیا گیا ہے، مشتعل تصویریں، جذباتی اور تخریب کار ویڈیوز بآسانی منتقل کی جارہی ہیں، اس کے لیے فسطائی طاقتوں نے ہزاروں باتنخواہ ملازمین (Paid Workers) مقرر کیے ہیں جو چوبیس گھنٹے (Around the clock) اسی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، اس کے سبب ملک کی آبادی میں یکجہتی کی جگہ نفرت بڑھ رہی ہے، کسی بھی جگہ بے قابو بھیڑ کسی معصوم کی جان لے لیتی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے انسان ہی انسان کے خون کا پیاسا ہوگیا ہو، ایک بڑا طبقہ طاقت وحکومت کے نشہ میں مست ہے، جانور کی محبت میں گلشن ہند کی خوبصورتی کو تار تار کر دینا چاہتا ہے، لیکن ہمیں انسانیت پر یقین رکھنے والوں سے امید ہے کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

ہندستان بہت بڑا ملک ہے، یہاں روزمرہ کچھ نہ کچھ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ہمیشہ ہوئے ہیں، (میرا مقصد کسی واقعہ کی اہمیت یا سنگینی وخطرناکی کو کم کرنا ہرگز نہیں) لیکن اس وقت ہر ہر واقعہ کے نتیجہ میں پورے ملک کی آبادی جس طرح احساس کمتری، خوف وہراس اور دہشت میں مبتلا ہوجاتی ہے اس میں بڑا کمال سوشل میڈیا کا ہے، ہر عامی کے ہاتھ میں ایک موبائل ہے، مودی جی کی کرامت نے انٹرنیٹ کی سروس مفت فراہم کرائی ہے، کسی کو نہیں معلوم کہ خبر کا مالہ وماعلیہ کیا ہے، واقعہ کی حقیقت کیا ہے، اس کے رونما ہونے کے اسباب کیا ہیں، بس ادھر سے ادھر خبریں منتقل ہو رہی ہیں، آگے بھیجی جارہی ہیں اور لوگ ہیں کہ دبے جارہے ہیں، سمٹے جارہے ہیں، سہمے ہوئے ہیں، خبروں اور واقعات کا تجزیہ کرنے والے کم ہیں، ان کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا رنگ دینے والے زیادہ ہیں، اس میں قطعی کوئی شک نہیں ہے کہ جیسے جیسے مرکزی حکومت اپنی میعاد کے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے ویسے ویسے پرتشدد واقعات، نفرت واشتعال انگیزی میں اضافہ ہورہا ہے، ایک طرف مرکز کی اقتصادی پالیسی نے عام تاجروں اور کسانوں کی کمر توڑ دی ہے تو دوسری طرف ان

کے بے لگام لیڈروں اور زہر آلود ذہنیت رکھنے والی بھیڑ نے لوگوں کا چین چھین لیا ہے۔

اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ یہ صورت حال ملک میں پہلی مرتبہ نہیں پیدا ہوئی ہے، اس کی ذمہ دار صرف بی جے پی نہیں ہے، ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے بعد سے آج تک نہ جانے کتنی مرتبہ ملک فسادات کی آگ میں جھلسا ہے، گھر گھر اور گلی گلی خوف ودھشت سے بھر گئی ہے، ایک عرصہ تک مسلمانوں کو تقسیم کا طعنہ دے کر ہراساں کیا گیا، پھر فرقہ پرستی کا الزام ان ہی پر لگایا گیا، اس سے چھٹی ملی تو ہر گر میں دھشت گرد نظر آنے لگا، لوگ اپنے گھر کے آہنی دروازوں کو مقفل کر کے بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے، اب تو خیر باہر نکلنے میں ہی ڈر لگ رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سخت جان قوم اس ملک میں کئی بار ڈوب ڈوب کر ابھری ہے، اس میں کیا شک کہ بی جے پی آر ایس ایس کے زیر سایہ پنپنے والی جماعت ہے، اس کے ممبران صاف کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت نہیں، بلکہ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے ووٹ دینے کا حق چھین لینا چاہیے، لیکن ہم کو قطعی نہیں بھولنا چاہیے کہ آج ہم جس طرح بیک فٹ پر ہیں، ہم سے اپنا دفاع بھی نہیں ہو پا رہا ہے، اس میں بڑا دخل اس کا ہے جو ہمارے ووٹ لے کر تاجدار ہند بنتا رہا، جی ہاں! آج ہم جس پوزیشن میں ہیں اس پوزیشن میں پہنچانے کا کام حکمت عملی کی کمی، فکری انارکی، نظریاتی آوارگی، ملی شعور کا فقدان، منصوبہ بندی کا نہ ہونا اور کانگریس کا وفادار بن کر رہنے کے سبب ہوا، لوگ جذبات میں کھو جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ جب حملہ کا اندیشہ مختلف سمت سے ہو، مقابلہ متعدد دشمنوں سے ہو تو تیاری اور منصوبہ بندی بھی ویسے ہی کرنی پڑتی ہے، مگر ہم نے زندگی آمنا و صدقنا میں گذار دی اور نتیجۃً آج اس مقام پر آ گئے جہاں بس خدا ہی خدا نظر آتا ہے، اس کے سوا کوئی پرسان حال نہیں، اتنا بڑا ملک، اتنی بڑی جمہوریت، اتنی بڑی حکومتی مشنری اور دفاعی قوت کے باوجود لوگ یہ کہہ کر دامن جھاڑ لیتے ہیں کہ کانگریس بھی بے چاری کیا کرتی، آر ایس ایس اس کو جینے کہاں دیتی ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ آر ایس ایس کے بال و پر کانگریس کی سرپرستی میں نکلے ہیں اور کانگریس نے کبھی اس کو نظر انداز نہیں کیا، البتہ اس کی فتنہ انگریزیوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے، ہندستانی مسلمانوں پر دہشت گردی کا عفریت مسلط کرنے کا کام اسی نے کیا، بلا وجہ، بلا جرم نوجوانوں کو اچک کر جیلوں میں ٹھونسنے کی طرح اسی نے ڈالی، پچاسوں ہزار نوجوانوں کو جیلوں میں ڈال دیا اور صرف آشیر واد لیتی رہی، اس کے بدلہ آشواسن دیتی رہی، معصوموں کے انکاؤنٹر کا سلسلہ بھی اسی کی ایجادات میں شمار ہوتا ہے، اور سب چھوڑ دیجئے، مودی کا اسرائیل دورہ لوگوں کے لیے بڑے کرب وتعجب کا باعث ہے مگر ہمارے لیے بالکل نہیں، جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ اسرائیل سے گہرے مراسم کی ابتدا بھی کانگریس کے دور میں ہوئی تھی، نرسمہا راؤ کے دور حکومت میں ۱۹۹۲ء میں اسرائیلی سفارت خانہ ہندستان میں قائم ہوا تھا، اس کی وجہ بھی لکھ دوں، ہر ملک اپنی خارجہ پالیسی اپنے ملک کے مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بناتا ہے، ہندستان کے بہت سے مفادات عربوں سے وابستہ تھے، اسرائیل

سے دوستانہ اور سفارتی تعلقات عربوں کی ناراضگی کا سبب ہو سکتے تھے، اگر چہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہند اسرائیل تعلقات نہ رہے ہوں، لیکن باضابطہ تعلقات کا آغاز تب ہوا جب ہندستان کو عرب اسرائیل تعلقات کا اچھی طرح علم ہو گیا، عین اس وقت جب خلیج میں امریکی فوجی اڈہ قائم ہوا، عربوں کی خودمختاری ختم ہوئی، ان کے اسرائیل سے تعلقات منظر عام پر آئے تو دوسروں کے اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے پر ناراض ہونے والا کوئی نہ رہ گیا، لہذا کانگریس میں بیٹھے اعلیٰ درجہ کے آر ایس ایس کے حامیوں نے برادرانہ حق ادا کیا اور سفارت خانہ کھولا گیا۔

اس وقت پوری دنیا جان گئی ہے کہ ریاض پر اسرائیل کا معنوی قبضہ مکمل ہو چکا ہے، ریاض وامارات کی حکومتیں اب صرف امریکی بل بوتے پر قائم ہیں اور اسرائیل کے تحفظ کے لیے کوشاں اور کام میں لگی ہوئی ہیں، خیر تو یہاں تک ہے کہ اب سعودیہ میں ایک ادارہ قائم کیا جا رہا ہے جہاں کتابوں کی تنقیح کا کام ہوگا، ایسا نصاب تیار کیا جائے گا جو شدت پسندی سے پاک ہو، اس ادارے میں ''معتدل'' (ہماری زبان میں معتدل کا مطلب اسلامی روح سے خالی اور سیکولر) ائمہ مساجد کی تربیت کی جائے گی، اسی ادارے کی راست نگرانی وائٹ ہاؤس کرے گا۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ جلد ہی ریاض میں اسرائیلی سفارت خانہ بھی قائم ہو جائے گا، اس صورت میں اگر ہم کو قرآن کریم کی آیت لتجدنَّ أشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا کی تفسیر پروٹوکول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یا ہو اور مودی کے گرم جوشی کے ساتھ گلے ملنے میں نظر آئے تو تعجب کیا؟ سعودیہ نے ہی تو ملت اسلامیہ پر ''احسان'' کیا تھا جب ہمارے وزیر اعظم کو اپنا سب سے بڑا اعزاز دیا تھا، ٹرمپ کو اپنی تاریخ کے سب سے قیمتی تحائف دیے، انکشاف تو یہاں تک ہوا کہ الیکشن میں نتن یاہو کو فنڈ بھی فراہم کیا، محمد بن سلمان کی ولی عہدی پر اسرائیلی میڈیا نے خوشی کا اظہار کیا جیسے سعودی امداد سے قابض ہوئے سیسی کی آمد پر استقبال کیا تھا، اب بھی اگر کسی کو تفسیر اور اسباب سمجھ میں نہ آئیں تو بڑی حیرت ہوگی، ہم متعدد واقعات پر اس آیت کا حوالہ دے چکے ہیں اور یہ لکھ چکے ہیں کہ وطن عزیز کی پالیسیاں طے کرنے میں اسرائیل کی حصہ داری یقینی ہے۔

یہاں یہ سطریں لکھنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیا نہیں ہے اور پہلی بار نہیں ہو رہا ہے، سب پرانا ہے اور ہوتا رہا ہے، ہم کو اس ذہنیت وشکست خوردگی کے نفسیاتی احساس سے باہر نکلنا پڑے گا، بغیر اس احساس شکست اور خوف ودہشت سے نجات پائے اس جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ملک میں انارکی پھیلانے، ہمارے تشخص کو مٹانے بلکہ ہم کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے پر آمادہ ہے، ہمت ہارنے، حوصلہ شکنی کا مظاہرہ کرنے، اپنے کو بے سہارا ظاہر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں، ہماری اسی روش میں تو فسطائیت کی جیت ہے، ہمارا سہارا اللہ تھا وہی ہمارا حامی وناصر ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کانگریس وسماجوادی کی ماتم پرسی اور ان پر نوحہ خوانی بند کی جائے، فکری انارکی، افتراق و

تخریب کو طلاق دے کر، ماضی کو سامنے رکھ کر نئے سرے سے حکمت عملی تیار کی جائے، بی جے پی اور آر ایس ایس سے خائف ہوکر گھروں میں دبک جانے سے کیا حاصل ہوگا، ضرورت ہے کہ ان کی سازشوں کا مقابلہ کیا جائے وران کے مقابلے کی تیار کی جائے، کیا یہ تلخ حقیقت نہیں کہ ہماری بڑی سے بڑی اور قدیم سے قدیم تنظیموں میں سے کوئی بھی ایسی تنظیم نہیں جس نے آر ایس ایس کی طرح چوطرفہ اور منظّم تیاری کی ہو، جب ہاتھ میں کچھ ہے ہی نہیں اور ایمان کا یہ حال کہ وہ کسی بھی وقت مفادات ومصالح کی بھینٹ چڑھ جائے تو خوف وہراس، احساس شکست وتخلف کی فضا ہی عام ہوگی، وقت کا تقاضا ہے کہ صف اول کی قیادت، دوسرے درجہ کی قیادت کو اعتماد میں لے کر نوجوانوں کا بھرپور استعمال کرے، ہمیں نہیں معلوم کہ ہماری اعلیٰ قیادتیں اس وقت کیا کر رہی ہیں مگر ان کے حضور ہمارا یہ التماس ہے کہ یہ وقت اقدام کا طالب ہے، حکمت آمیز اور خاموش منصوبہ بندی چاہتا ہے، تمام طبقوں اور تنظیموں کا اتحاد اس وقت دفاع تشخص کے لیے ضروری ہے، اس وقت اسی نسخہ کا استعمال کر کے ملت کو متحد کرنا ہوگا جس کے ذریعہ حضرت سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ملت کے منتشر شیرازہ کو منظّم ومجتمع کرلیا تھا، یہ وقت میدانی کام اور عملی نمونے پیش کرنے کا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ کوئی نہ کوئی بندۂ خدا پہل کرے گا اور ایک خاموش منصوبہ بند حکمت عملی تیار کرنے اور شیرازہ بندی کرنے کی مہم چھیڑے گا، نوجوان جو پٹ جاتا ہے، راہ سے ہٹ جاتا ہے، اس وقت ٹکٹکی باندھے قیادتوں کی طرف دیکھ رہا ہے، اس کو اس ملک میں اپنا مستقبل تاریک لگ رہا ہے، اسے اپنی زندگی اور تیسری وچوتھی نسل خطرے میں نظر آنے لگی ہے، کوئی تنظیم نہیں ہے جو اس کو جوڑے، کام دے، پروگرام دے، استعمال کرے اور مستقبل کے لئے تیار کرے، اس لئے مناسب ہوگا کہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ملت کی شیرازہ بندی اور منصوبہ بندی کا کام شروع کیا جائے، نوجوانوں کے لیے ملک گیر سطح پر پروگرام چلائے جائیں، میڈیا اور سوشل میڈیا کے لئے افراد تیار کیے جائیں اور مستقبل کی بھرپور تیاری کی جائے، جھوٹے اور باطل سہاروں کو چھوڑ کر خالق کائنات اور اپنے اصل سہارے پر مکمل یقین رکھا جائے، خلوص و ایمانداری کے ساتھ اگر صحیح سمت میں محنت کی جائے تو وہ خدا کبھی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا، وہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، وہ اپنی ذات سے وابستہ اور امید لگانے والوں کو مایوس نہیں کرتا، ہم تو یہ تسلیم کر کے جیتے ہیں کہ ؎

آپ کی غلامی کا بوجھ ہم نہ ڈھوئیں گے
آبرو سے مرنے کا فیصلہ ہمارا ہے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

❑ پیام سیرت

# زندگی ہے آپ پر قربان ہو جانے کا نام

محمد فرید حبیب ندوی

''اے اللہ! سب تجھ سے بینائی کی اور بینائی کی سلامتی کی دعا مانگتے ہیں.....مگر اے مولیٰ! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تو مجھ سے میری آنکھوں کی روشنی لے لے''۔

وہ ایک انسان ہی تھا.....مگر سب سے عجیب اور سب سے نرالا۔

ہر طرح سے تندرست و توانا.....دانا اور بینا۔

اس کے جسم کو بھی اللہ تعالی نے ہر طرح کی خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا.....اس کا ہر عضو صحیح سالم تھا.....مگر باوجود اس کے کہ جسم انسانی کا ایک ایک عضو قیمتی اور انمول ہے.....اور حضرت انسان کے وجود میں قدرت کی کرشمہ سازیوں کی ایک کائنات آباد ہے.....یہاں دل بھی ہے، دماغ بھی .....کان بھی ہیں اور آنکھیں بھی.....اور ہر ایک کی اپنی حیثیت ہے۔

دل ہے تو جہاں ہے.....دل کی دھڑکن پر انسان کی زندگی موقوف.....دل نہ رہے یا اس کی دھڑکن کا سلسلہ رک جائے تو انسانی زندگی کا تار نفس ہی ٹوٹ کر بکھر جائے۔

دماغ کی کرشمہ سازیاں بھی آپ دیکھ ہی رہے ہیں.....سال کا ہر مہینہ اور مہینے کا ہر دن دماغ کی سرگرمیوں کا کوئی نہ کوئی عجوبہ دکھا رہا ہے۔

ان سب میں آنکھ کی ایک الگ ہی شان ہے.....آنکھ سے ہی یہ دنیا روشن اور منور ہے..... یہ خوبصورت کائنات.....یہ لہلہاتے کھیت.....یہ سبز وادیاں..... یہ آبشار اور جھرنے.....یہ بہتی ندیاں اور جوش مارتے سمندر.....یہ ہیبت ناک پہاڑ اور چمکتے ستارے.....یہ سب اور ان سب کی خوبصورتی .....اسی آنکھ کی روشنی پر موقوف ہے.....آنکھ کی روشنی کے بغیر یہ حسین کائنات اندھیری اور تاریک ہے۔

ایک نابینا کے دل سے پوچھو کہ اس پُر بہار کائنات کی لذتِ دید سے محرومی.....کیسی الم ریز اور غم انگیز ہوتی ہے۔

اور تو اور.....ماں کے چہرے کی ممتا بھی آنکھوں کے بغیر کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے!!.....اُس سے ذرا کوئی حالِ دل پوچھے، جو اِس عظیم نعمت سے بھی محروم ہو۔

اسی لئے آپ کو کوئی ایسا نہ ملے گا جو یہ تمنا کرے کہ اس کے پاس آنکھوں کی روشنی نہ رہے.....اس کے برعکس ایسے ہزاروں مل جائیں گے جو یہ آرزو رکھتے ہوں گے کہ انہیں بینائی مل جائے.....اور ان کی بینائی سلامت رہے۔

اس سب کے باوجود اندھے پن کی تمنا کرنے والا وہ کون تھا؟؟.....جو یہ عجیب دعا کر رہا تھا:''اے اللہ! مجھ سے میری آنکھوں کی روشنی چھین لے''۔

تاریخ انسانی کی سب سے نرالی تمنا۔

ابن آدم کے لبوں پر آنے والی سب سے عجیب دعا۔

اس لئے جس نے بھی سنا.....دنگ رہ گیا۔

اور سچی بات یہ ہے کہ جو بھی سنتا، دنگ ہی رہ جاتا۔

آخر یہ بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے؟؟

کوئی مجنوں اور دیوانہ ہی ہوگا..... جو ایسی تمنا کرے۔

اور سچ بتاؤں؟؟..... وہ بھی دیوانہ ہی تھا۔

مگر..... اس کی دیوانگی سب سے الگ..... اور انوکھی تھی۔

اس رنگ برنگی دنیا میں کوئی حسن کا دیوانہ ہے..... کوئی مال و دولت کا..... اور کوئی شہرت و جاہ کا۔

اس دیوانی دنیا میں دیوانگی کی بیسیوں قسمیں ہیں..... اور ہزاروں دیوانے ہیں..... مگر..... اس کی دیوانگی سب سے نرالی تھی..... وہ ایک الگ ہی قسم کا دیوانہ تھا۔

اس کی دیوانگی نہ مال و دولت کے لئے تھی ..... نہ شہرت و ناموری کے لئے..... اور نہ حسن و جمال کے لئے۔

اس کی دیوانگی اس کے لئے تھی، حسن بھی جس کا دیوانہ ہے۔

اس کی دیوانگی اس کے لئے تھی، مال دولت بھی جس کے قدموں پر قربان۔

اس کی دیوانگی اس کے لئے تھی، شہرت و ناموری بھی جس پر فریفتہ و جاں نثار۔

''ارے بھائی!! تم یہ دعا کیوں مانگ رہے ہو؟'' کسی نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

یہ سوال سن کر وہ پھڑک اٹھا..... اس کا رواں رواں کھڑا ہوگیا..... جذبات میں بھونچال..... اور خیالات میں طوفان آ گیا..... آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''ارے، آپ تو رونے لگے..... بتایئے کہ آخر بات کیا ہے؟..... سائل نے ڈھارس بندھاتے ہوئے پھر سوال دوہرایا۔

''میں آنکھوں کی روشنی کا کیا کروں گا؟ ..... میں ان آنکھوں سے کسے دیکھوں گا؟..... اب یہ روشنی میرے کسی کام کی نہیں''۔ رندھی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا۔

''کیوں؟ تھوڑی چیزیں ہیں دیکھنے کی؟؟ ان آنکھوں سے ہرا بھرا آسمان دیکھئے..... چمکتے ستارے دیکھئے..... لہلہاتی کھیتیاں اور رقص کرتی ندیاں دیکھئے..... کائنات میں ہزاروں خوبصورت چیزیں ہیں..... ان سب کو دیکھئے۔''

''اوہ!! بس! صرف ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہیں یہ آنکھیں!!

میری آنکھیں روشن تھیں تو صرف اس کے دیدار کے لئے..... ان میں بینائی اگر تھی، تو اسی کے رخ زیبا کی زیارت کے لئے..... میں اِن کے ذریعہ جس کے دید سے لذت کام و دہن پاتا تھا..... اب جب وہ ہی نہ رہا..... تو یہ میرے کس کام کی؟؟..... یہ خوبصورت کائنات..... یہ آفتاب و ماہتاب سب اسی لئے تو ہیں کہ اس کے حسن میں اضافہ کریں..... اس کی خوبصورتی کے خادم ہیں یہ سب..... اگر وہ نہیں تو ان سب کی خوبصورتی کا کوئی مول نہیں''۔

''ارے بھائی!! سب ہی ان آنکھوں کی روشنی کے متمنی رہتے ہیں..... کوئی ان سے ماں کے چہرے کی ممتا دیکھتا ہے..... کوئی ان سے اولاد کے چہرہ کی معصومت دیکھتا ہے..... کوئی ان سے یہ ہرے بھرے نظارے دیکھتا ہے..... کوئی ان سے محبوب کا دیدار کرتا ہے..... یہ سب چیزیں بھی ہیں محبت کے لئے..... یہ بھی ہیں دیکھنے کے لئے''۔

''نہیں..... نہیں..... میرے لئے ان میں کوئی کشش نہیں..... میرے لئے ان میں کوئی حسن نہیں..... میری محبتوں کی انتہا..... میری چاہتوں کا منتہا..... میری الفتوں کا مسکن..... وہ تھا..... صرف وہ..... اس کے بنا یہ ساری چیزیں ادھوری ہیں میرے لئے''۔

کون تھا وہ؟؟..... سائل کی بے تابی بڑھتی جارہی تھی۔

پوچھتے ہو وہ کون تھا؟..... وہ میری آنکھوں کا نور تھا..... وہ میرے دل کی دھڑکن تھا..... وہ میرا آقا ..... میرا محبوب

تھا..... وہ اللہ کا آخری رسول تھا.....اب اس کے بعد دنیا کی آنکھیں تا قیامت کسی نمائندۂ خدا کا دیدار نہ کر پائیں گی۔

یہ کوئی اور نہیں، صحابی رسول، صاحب الاذان حضرت عبداللہ بن زید انصاریؓ تھے، رسول اللہ ﷺ سے بے انتہا محبت کرنے والے، آپ کے عاشق زار.....محبّ جان نثار.....یہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے خواب میں اذان کے کلمات سنے، اور ان کا خواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے اسی دن سے اذان مشروع فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام جنگوں اور اہم مواقع پر شریک رہے، حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے کچھ موئے مبارک عطا فرمائے، تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا.....وہ بال ان کے لئے متاع زندگی اور حاصل زندگی بن گئے..... تا زندگی انہیں سنبھال کر رکھے رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے گھر والوں نے انہیں محفوظ رکھا۔

مذکورہ بالا واقعہ ان کے عشق رسول کا جیتا جاگتا ثبوت ہے.....ان کے عشق کی انتہا ہمارے تصور سے بالاتر ہے.....وہ بینا تھے تو صرف آپ کے لئے.....زندہ تھے تو صرف آپ کے لئے.....اور سچ یہ ہے کہ ان کا رواں رواں حبِ رسول اور عشقِ حبیب کا ترجمان تھا۔

آپ جاننا چاہیں گے کہ ان کی دعا کا کیا ہوا؟.....وہ بینا ہی رہے یا نابینا کر دئے گئے؟؟

تو سنئے! اللہ تعالی بھی ان کی دعا رد نہ کر سکا.....وہ ان کے جذبات کی گہرائی سے باخبر تھا.....اس لئے اسے علم تھا کہ اِس دعا میں کتنی سچائی بھری ہے.....اور پھر اس نے اس کی دعا قبول کر ہی لی۔

اور اس طرح ایک جاں نثار وفدا کار.....اپنے محبوب کی محبت میں خوشی خوشی نابینا ہو گیا۔

صحابہ کرام کے تذکروں میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں.....جو ہمیں دعوت عبرت اور پیام عمل دیتے ہیں..... ان کی زندگی ہمارے لئے راہ عمل اور نشان راہ ہے.....ان کی ایک ایک ادا واجب العمل اور قابل تقلید ہے۔

جو لوگ اپنے رسول کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے..... جنہیں اپنے محبوب کے بغیر یہ کائنات سونی اور ویران لگتی تھی.....آج انہی کے جانشین ہم ہیں!!!

شرم آتی ہے خود کو مسلمان کہتے ہوئے.....جبینِ نیاز عرق آلود ہو جاتی ہے خود کو ان کا جانشین بتاتے ہوئے۔

ذرا سوچیے تو سہی!! کوئی جوڑ ہے ان میں اور ہم میں!!

وہ کہاں اور ہم کہاں؟؟

ان کی دنیا ان کا رسول تھا.....اور ہماری دنیا؟؟

ان کی آرزوؤں کا منتہا ان کا محبوب تھا.....اور ہماری تمناؤں کا محور؟؟

وہ عشق رسول میں پاگل تھے.....ہم حب دنیا میں پاگل ہیں۔

وہ درِ حبیب کے لئے تڑپتے تھے.....ہم حصول زر کے لے تڑپتے ہیں۔

ان کی آنکھیں صرف محبوب کے چہرہ پہ پڑتی تھیں..... ہماری آنکھیں بے حیائی کی ہر حد کو پار کیے ہوئے ہیں۔

پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم جانشین صحابہ ہیں.....ہم عبداللہ بن زیدؓ کے جانشین ہیں..... سوچئے تو! ہم کیا دعوی کر رہے ہیں!!.....ایک بار ذرا دل تھام کر اس دعوی کی سچائی پر غور کر لیجئے.....پھر بتائیے! کیا ہم حقیقت میں حضرت عبداللہ بن زید کے ماننے والے ہیں؟؟.....کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا ہمارے جھوٹ کو منہ چڑھائے۔

☆☆☆

❑ خاص تحریر

# ارمانوں کا خون

ابوسعد چارولیہ

آج صبح ہی سے گھر پر ایک خاص قسم کی ہلچل تھی، کوئی بھاگ رہا ہے، کوئی دوڑ رہا ہے، کوئی بازار میں سامان لینے جا رہا ہے۔ ابّا آج صبح سویرے بغیر نہائے دھوئے کام پہ نکل گئے، بڑی بہن کی پھرتی قابلِ دید تھی، وہ امّی کے ساتھ مل کر ٹفن تیار کر رہی تھی، چھوٹی بہن ادھر سے ادھر کودتی جا رہی تھی کہ بھیّا آج مدرسے کو جائیں گے، اتنے میں چھوٹے بھائی کی آواز آئی: امّاں! میں بھیّا کے لیے ناشتہ اور ضروری چیزیں لے آتا ہوں؟

غرض یہ کہ گھر بھر میں عید کا سماں تھا اور ایک مابدولت تھے جو گال پھلائے، شکنیں چڑھائے، زمانے بھر سے بیزار بیٹھے تھے، دل میں تو بار بار آ رہا تھا کہ آج تو جی کڑا کر کے کہہ ہی دیں: "مجھے مدرسہ وَدرسہ نہیں جانا، تم لوگ یہاں مزے کرتے ہو اور میں میلوں دور وہاں جھک ماری کرتا ہوں، بہت ہو گیا، اب کے میں کسی بھی حال میں مدرسہ نہیں جاؤں گا" دل ہی دل میں طرح طرح کے خیالات آتے اور جاتے رہے، دماغ وسوسوں کا جال بنتا اور پھر خود بہ خود ٹوٹ جاتا، قسمہا قسم کے ڈائیلاگز ذہن میں کلبلاتے اور پھر بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کا موقع آتا تو اپنی موت آپ مر جاتے؟ اسی سوچ بچار میں کوچ کا وقت ہو گیا، اوپرے دل کے ساتھ دو لقمے مارے اور اٹھ گیا، بے چاری امّی پکارتی رہی کہ بیٹا! سفر ہے کچھ تو کھا لو، مگر یہاں گھر چھوڑنے کے غم کے ساتھ غصہ اِس پر بھی تھا کہ ابّا نے صرف دو ہزار روپے کیوں دیے، لہٰذا اس غصے کا اظہار ضروری تھا، ابّا یہ سارا ماجرا دیکھ کر سمجھ گئے کہ اصل درد کہاں ہے! بغیر کھائے چپ چاپ اٹھے اور بیڈ روم سے اپنا کرتا اٹھا لائے اور جیب میں جتنے پیسے تھے ریزگاری سمیت (تین سو روپے) سب نکال کر دے دیے؛ یہاں تک کہ آخر میں ایک روپیہ کا سکّہ نکل آیا وہ بھی دے دیا، خدا جانے! ذہن پر کس قسم کا بھوت سوار تھا کہ کچھ سوچے بنا وہ ایک روپیہ بھی لے لیا، کن اکھیوں سے دیکھا کہ گھر کے سبھی افراد کو میری یہ حرکت نہایت ناگوار گذری؛ مگر کسی نے کچھ کہا نہیں تو میں نے بھی اس خیال کو ایسے ہی جھٹک دیا جیسے بے وقت آئی ہوئی مکّھی اڑائی جاتی ہے۔

خیر! ابا تو ایک لقمہ بھی نہ کھا سکے تھے، امّی نے بھی زبردستی دو لقمے ٹھونسے اور اٹھ گئیں، سب لوگ ہاتھ دھو کر مابدولت کو رخصت کرنے کے لیے تیار ہو گئے چھوٹے بھائی نے - جسے پچھلے مہینے فیس نہ بھرنے کی وجہ سے اسکول سے نکال دیا گیا تھا - بیگ اٹھایا، امّی نے مسکراتے ہوئے ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا اور ماتھا چوم کر بلائیں لیں، ابّو نے سر پر ہاتھ پھیرا، کچھ نصیحتیں کیں، جس کا آخری جملہ یہ تھا: "بیٹا! محنت سے پڑھنا، وقت ضائع مت کرنا، ہم بڑی مشقتوں سے تمہیں پڑھا رہے ہیں" نہ جانے اس جملے میں کیا کسک تھی کہ بے اختیار آنکھیں اوپر اٹھ گئیں اور دل کانپ کر رہ گیا، ابّو کا چہرہ گوسپاٹ

اور ہر قسم کے تأثرات سے خالی تھا؛ تاہم آنکھوں میں چھپا درد جھلک رہا تھا؛ بلکہ چھلکنے کو تھا، ہونٹوں پہ زخمی تبسّم تھا اور آنکھوں میں درد کے سائے لہرا رہے تھے، امّی تو ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی رودی تھی، قبل اس کے کہ مجھ سنگ دل کی آنکھیں اپنا کام کرتیں دھیمی آواز سے سلام کر کے تیزی سے زینے اتر گیا۔

آج پہلی مرتبہ چھوٹا بھائی خاموش تھا میں نے چھیڑا تو اسے بھی آج ہی ابلنا تھا، کہنے لگا: بس بھیّا! کیا بتائیں! آپ کے جانے کے بعد گھر کی کیا حالت ہوتی ہے! آپ کے جاتے ہی چھوٹی بہن پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہے، امّی بیڈ روم میں جا کر بستر پر اوندھے منہ گر جاتی ہیں، بڑی بہن بالکنی میں کھڑے کپڑوں کے بجائے آنسو سکھا رہی ہوتی ہے،، ابّو ان سب کو چھوڑ کر پتہ نہیں کیوں ہمیشہ باتھ روم میں چلے جاتے ہیں، تمہارے جانے کے بعد اکثر گھر میں آٹھ آٹھ دن تک صرف کھچڑی پکتی ہے جسے سب گھر والے اَچار یا چٹنی کے ساتھ ملا کر کھا لیتے ہیں، سب سے برا حال گھر پر امّی کا ہوتا ہے، بسا اوقات تین تین دن تک کچھ کھاتی نہیں ہے، ایک چپ سی لگ جاتی ہے، پورا پورا ہفتہ گذر جاتا ہے اور ہم لوگ امّی کے منہ سے ایک جملہ سننے کو ترس جاتے ہیں، رات کو چپکے چپکے میں دیکھتا ہوں، امّی کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔

تمہیں پتہ ہے ایک مرتبہ اچانک رات کو مری آنکھ کھلی، کسی کے رونے کی آواز آرہی تھی، دیکھا کہ امّی جان مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی ہیں، میں قریب ہی تھا، ہچکیوں کے درمیان صرف اتنا سن پایا کہ اے اللہ! میرا معاذ.....۔

صبح جب میں نے ابّو کو قصہ سنایا تو ابّو کہنے لگے: بیٹا! تمہاری امّی تو بیسیوں مرتبہ رات کو اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ تو روتی ہوئی بڑی بے بسی سے کہتی ہے: بس! یونہی اچانک خیال آ گیا کہ میرے معصوم بچے نے کھایا بھی ہوگا یا نہیں! اسے کوئی ستاتا تو نہ ہوگا! وہ اگر بیمار ہو گیا تو میرے لختِ جگر کو کون دیکھے گا" اسی قسم کے جملے کہہ کہہ کر خود بھی روتی اور مجھے بھی رلاتی ہے اور جس رات یہ قصہ پیش آتا ہے پھر وہ رات میری اور تمہاری امّی کی مصلّے پر گذر جاتی ہے۔''

چھوٹا بھائی اپنی رَو میں یہ سب سناتا جا رہا تھا اور میں حیرت و تعجّب کے مارے بت بنا اپنی جگہ کھڑا تھا، چھوٹے بھائی نے کہا: بھیّا! جس دن ہم بہن بھائی رات کو کھا پی کر فارغ بیٹھتے ہیں تو سب سے زیادہ تمہاری باتیں کرتے ہیں اور امّی کھل کر تمہارے بچپن کے قصے سناتی ہیں اور ہر مرتبہ ابّو اخیر میں اٹھتے ہوئے یہ کہتے ہیں "تم لوگ دیکھنا ایک دن میرا بیٹا بہت بڑا عالم بنے گا"

مجھ پر یکے بعد دیگرے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے جا رہے تھے اور رفتہ رفتہ حیرت کی جگہ ندامت و شرمندگی لے رہی تھی۔ بلڈنگ کے نیچے کھڑے کھڑے ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ میرا جگری دوست خالد آدھمکا اور اپنے بے تکلّفانہ انداز میں کہنے لگا: "بس کیا یار! اتنی جلدی چل دیے، ابھی تو آئے تھے" میں مسکرا کے ٹال گیا تو اسے کچھ یاد آ گیا، کہنے لگا: یار! آج صبح غضب ہو گیا، تمہارے ابّو صبح سویرے حاجی جنید کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے اور حاجی چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا کہ :" صبح صبح بھکاری قرض مانگنے آجاتا ہے، حیثیت نہیں ہے تو اپنے بیٹے کو نوکری پہ لگا، کیوں حرام کا مدرسے میں ڈال رکھا ہے اور اس سے پہلے والے سال بھی تو بچے کے بہانے قرض لے گیا تھا وہ تو ابھی تک نہیں دیے... اور پتہ نہیں حاجی کیا کیا بکتا رہا، اخیر میں کالر پکڑ کے اس نے ابّا کو ایک تھپّڑ مار دیا اور جیب سے دو ہزار کی نوٹ نکال کر یہ کہتے ہوئے منہ پر ماری کہ: لے بھکاری! آئندہ ہفتے کسی بھی حال میں مجھے سب پیسے واپس

چاہیے "ابّو نیچے گری ہوئی نوٹ اٹھا کر سر جھکائے آگے بڑھ گئے، صبح کا وقت تھا، سنّاٹا تھا، یہ منظر میرے سوا کسی نے نہیں دیکھا، مجھ سے برداشت نہ ہوسکا، میں نے لپک کر پوچھا: چچا جان! آپ تو محلّے کے شریف اور عزّت دار آدمی ہیں، آخر اس کمینے بڈّھے سے اتنا دَبنے کی کیا ضرورت ہے! یہ سب ذلّتیں کیوں برداشت کررہے ہیں! کیا ہم دوست لوگ مل کر اس بڈّھے کو ٹھکانے لگادیں؟! ابّا جی کی آنکھ میں آنسو آگئے، کہنے لگے: نہیں جی! اگر میں دو ہزار لے کر نہیں گیا تو میرا بیٹا مدرسے میں نہیں جاپائے گا اور میں اس کو پڑھا کر جنّت کمانا چاہتا ہوں دائمی جنّت کے لیے عارضی ذلّت برداشت کررہا ہوں"۔

یہ قصہ سن کر میرا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں، میری نظروں کے سامنے گھر سے نکلتے وقت پیسوں والا قصہ گھوم گیا، میں اپنے آپ کی نظر میں ذلیل ہوگیا تھا، چھوٹا بھائی مجھے دیکھ رہا تھا؛ مگر میں اس سے نظر ملانے کے قابل نہ تھا، مجھے زمین اپنے پیروں تلے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، خالد تو یہ حادثہ سنا کر چلا گیا اور چھوٹا بھائی بیگ اٹھا کر چپ چاپ آگے کو چل دیا، میں بوجھل قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

مسجد کے قریب ہی ناظرے کے بوڑھے استاد مل گئے، انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں اور کہا کہ: "بیٹا! محنت سے پڑھنا، بڑی مدت کے بعد اس بستی سے کوئی عالم بنے گا، تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں، تم ہماری پونجی ہو، اپنے آپ کو ضائع مت کردینا" میں انہیں کیا جواب دیتا کہ اب تک کی زندگی تو ضائع ہی کیے جارہا تھا۔

بستی سے نکلتے وقت اچانک کسی نے آواز دی، رک جاؤ بیٹا! مڑ کر دیکھا تو بستی کے بوڑھے بابا جی تھے، بڑی مشکل سے چوراہے پہ بچھی چارپائی سے اٹھے، لکڑی کے سہارے ٹیک لگاتے ہوئے آئے، قریب آکر محبت پاش نظروں سے دیکھا اور آبدیدہ ہوکر کہنے لگے: "تم مدرسہ جاتے ہو تو دل بڑا خوش ہوتا ہے، بیٹا! ہم گنہگاروں کے لیے دعا کرنا، اپنی زندگی میں تو کچھ نہ کرپائے اب تم جیسے بچوں کے سہارے جی رہے ہیں کہ جنت میں تم جاؤ گے تو تمہارا دامن پکڑ کر پیچھے پیچھے ہولیں گے، دیکھیو! اس دن اپنے گنہگار بابا جی کو بھول مت جانا" بندہ سر جھکائے شرمندگی کے ساتھ ان کی گزارشات سنتا رہا اور اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے، اسٹیشن پہنچے، ٹرین نکلنے کو تھی، میں جلدی سے لپک کر چڑھا، بھائی نے باہر سے بیگ پھینکا اور ٹرین فرّاٹے بھرتی ہوئی تیزی سے دوڑنے لگی، میں سامان وہیں دروازے پر چھوڑ کر کھڑا ہوگیا محبوب وطن کی گلیاں نگاہوں کے سامنے سے گذر رہی تھیں، کبھی ابّو جی کا غمزدہ چہرہ سامنے آجاتا، کبھی روتی ہوئی امّی یاد آجاتی، کبھی چھوٹی بہن کا سراپا نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا، کبھی چھوٹا بھائی ہاتھ لہراتا نظر آتا، کبھی شفقت فرماتے ہوئے مکتب کے استاد جی دکھائی دیتے اور کبھی بابا جی کی لجاجت بھری درخواست جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی، پھر پتہ نہیں اچانک مجھے کیا ہوا کہ میں دروازے پہ کھڑے کھڑے پھوٹ پھوٹ کر اتنا رویا کہ شاید وبایدہی کبھی زندگی میں اتنا رویا ہوں گا۔ یہ احساسِ زیاں کے آنسو تھے جو اب تک کی ضائع شدہ زندگی پر بہہ رہے تھے، یہ اپنوں کے ارمانوں کا خون تھا جو آنسو کی شکل میں جاری تھا۔

پیارے طالب علم بھائیو! بے شک مذکورہ بالا سطریں تخیلاتی ہیں؛ لیکن اگر گھر سے نکلتے وقت عبرت کی آنکھیں کھلی رکھی جائیں، اپنے گرد وپیش پر نظر دوڑائی جائے تو یہ سارے مناظر کھلی آنکھوں دیکھے جاسکتے ہیں، جب تم گھر سے نکلو تو ابّا کی زخمی

مسکراہٹ کو غور سے دیکھا کرو، تمہیں ان میں کچھ اَن کہی کہانیاں نظر آئیں گی، کبھی غور کیا کہ امّی کے ہونٹ مسکراتے ہوئے کپکپا کیوں جاتے ہیں! کبھی سوچا کہ بہن دروازے تک کیوں نہیں آتی؛ اس لیے کہ کہیں اس کے آنسو دیکھ کر تمہارے حوصلے ٹوٹ نہ جائیں، گھر کا ہر فرد لاکھ غموں کے باوجود خوشی خوشی تمہیں رخصت کرتا ہے؛ صرف اس لیے کہ تمہاری ہمت نہ ٹوٹ جائے؛ ورنہ کون بھائی بہن ہیں جو اپنے بھیّا کی جدائی پر نہ روئے! کون باپ ہے جو اپنے جگر کے ٹکڑے کی فرقت پر ہنس رہا ہو! اور دوستو! کونسی ماں ہے جو لب پر تبسّم سجائے اپنے پیارے بیٹے کی جدائی دیکھتی رہے بخدا! بخدا! بخدا! ان سب پر ہماری جدائی شاق ہے، ابّو جی کو محلّے کے ذلیل آدمی سے گالیاں کھانے کا شوق نہیں چراتا، وہ ہمارے لیے گالیاں سنتے ہیں، وہ صرف اور صرف ہمارے لیے پسینے میں ڈوب کر محنت کرتے ہیں، مکتب کے استاد جی دو ہزار کی تنخواہ پر برسوں سے ٹِکے ہوئے ہیں؛ صرف اس تمنّا میں کہ بستی کا کوئی بچہ میری نظروں کے سامنے عالم بن کر آجائے اور اس امانت کو سنبھال لے، باباجی سے پوری بستی ڈرتی ہے؛ مگر وہ تمہارے سامنے صرف اس لیے جھکے ہوئے ہیں کہ ان کی جنّت کا سوال ہے!

دوستو! آؤ! گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ کیا ہم اس قابل ہیں کہ کسی کی جنّت کا سامان کرسکیں! کیا ہمارے پاس ایک سجدہ بھی ایسا ہے جس میں خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آیا ہو! جو ماں ہمارے لیے بیسیوں مرتبہ اٹھ کر روتی ہے کیا ہم نے پورے سال میں کبھی ایک مرتبہ بھی اس پیاری امّاں کے لیے ہاتھ اٹھائے! ہم کیسے سنگ دل بیٹے ہیں! ماں کے نام پر تو ساری دنیا کا دل پگھل جاتا ہے مگر ہم اپنی خواہشوں میں ایسے مدہوش ہیں کہ ماں تک کی قربانیوں کا ہمیں احساس نہیں! کیا ایک موبائل کی اتنی وقعت ہے کہ اس کے پیچھے اتنے سارے لوگوں کی قربانیاں ضائع کردی جائیں! کیا ہماری بیہودہ گپ شپ اتنی قیمتی ہے کہ ہم کسی کے ارمانوں کا خون کردیں! کیا مدرسے کے عارضی دوستوں کی اتنی قدر ہے کہ ان کے لیے پڑھائی چھوڑ کر اپنوں کی تمناؤں کا جہاں اجاڑ کر رکھ دیں!

کب تک بے مقصد زندگی جئیں گے! کب تک مدرسے میں پڑے پڑے اپنی اور دوسروں کی زندگی ضائع کریں گے!

یاد رکھو دوستو! آج اگر ہم کسی کے ارمان کا خون کرتے ہیں تو کل کو ہمارے عزیز بھی ہمارے ارمانوں کا خون کریں گے، آج اگر ہم کسی کی قربانیاں رائیگاں کیے بیٹھے ہیں تو کل کو ہماری قربانیاں بھی رائیگاں جائیں گی!

پیارے بھائیو! اس ابّو کا واسطہ جو ہمارے لیے ذلّتیں جھیل گیا؛ اس امّاں کا واسطہ جس کا کوئی پَل ہماری یاد کے بغیر نہیں گذرتا؛ مکتب کے اس شفیق استاد کا واسطہ جن کی دعائیں ہمارے نام کے بغیر پوری نہیں ہوتیں، اپنی زندگی پر غور کرو، خدارا! وقتی لذّت کے لیے دائمی ذلّت کا سودا نہ کرو۔

دوستو! آؤ! آج میں اور آپ مل کر ارادہ کرتے ہیں کہ: اب کے مدرسے کی زندگی کچھ الگ زندگی ہوگی، اب کے شب و روز مقاصد کے ساتھ گذریں گے، اب محفلوں میں اور لغویات میں وقت ضائع نہ ہوگا، اب کے اساتذہ کے احترام میں ذرّہ برابر کمی نہ ہوگی، اب کے ایسی محنت ہوگی کہ دوسروں کو ترس آجائے گا، اِس مدرسے میں ہم اپنے اللہ کی محبت لینے کے لیے آئیں گے، اب کے رات کو اٹھ کر روٹھے ہوئے پیارے اللہ سے معافی مانگیں گے، اب کے نافرمانی والی زندگی کے بجائے اطاعت والی زندگی گزاریں گے۔ انشاءاللہ! کہو انشاءاللہ!!!

☆☆☆

❑ مناسک حج

# حج سے متعلق چند مشہور کوتاہیاں

مولانا ندیم احمد انصاری

حج سے متعلق بہت سی غلط کوتاہیاں ہمارے یہاں پائی جاتی ہیں، ایک عام کوتاہی تو یہ ہے کہ حج کے ادا کرنے میں لوگ سستی بہت کرتے ہیں، وہمی ضروریات و خیالی تعلقات سے فارغ ہونے کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام سے فارغ ہوکر چلیں گے، پھر اس کام کے بعد دوسرے کام کا اسی طرح انتظار رہتا ہے، حالاں کہ یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا۔ بعض لوگ حج کا ارادہ رکھتے ہیں اور حج کو اپنے اوپر فرض بھی جان چکے ہیں لیکن اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں کہ ہم تم دونوں ساتھ چلیں گے، یہ سخت غلطی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس دوست کو چاہیے کہ ان سے لکھوالے کہ میں اور تم دونوں اس وقت تک زندہ بھی رہیں گے، ذرا ہم بھی تو دیکھیں، وہ اس مضمون کو کیوں کر لکھتے ہیں۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ سفرِ حج کو اس وقت فرض سمجھتے ہیں، جب مدینہ منورہ کے سفر کے لیے بھی وسعت ہو اور اگر اتنا خرچ ہو کہ صرف حج کر سکتا ہے، مدینہ منورہ نہیں جا سکتا تو یہ لوگ اس حالت میں حج کو فرض نہیں سمجھتے، یہ سخت غلطی ہے۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اوقات اس شخص کے پاس مالِ حرام اس مقدار میں جمع ہو جاتا ہے کہ حج کو کافی ہو، مگر یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو مالِ حرام ہے، اس کا حج میں خرچ کرنا اور بھی زیادہ برا ہے اور مالِ حلال میرے پاس اس قدر ہے نہیں، اس لیے میرے ذمّے حج فرض نہیں اور یہی خیال بعض لوگوں کا زکوٰۃ میں بھی ہے، پس یہ لوگ حج کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں، سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مدارِ فرضیتِ حج و زکوٰۃ کو خاص مقدارِ مال کا مالک ہونا ہے، اس کے حلال ہونے کو فرضیت میں دخل نہیں، اس لیے ایسے شخص کے ذمّے حج اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں گو قبول نہ ہوں۔ بعض لوگ، جن کے پاس نہ تو حج کا سامان ہے اور نہ قلب میں غنا اور قوّتِ توکل ہے، مگر لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر ان کو پریشان کر کے حج کو جاتے ہیں، سو اس طرح حج کو جانا حرام ہے۔ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل یا جہاز وغیرہ میں نمازیں برباد کرتے ہیں، سو انھوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور اتنے کثیر فرض فوت کیے اور اگر حج فرض نہیں تھا، نفل تھا، تو اور بھی غضب ہوا کہ ایک نفل کے لیے اتنے فرض گئے، سو ایسے شخص کو اس طرح حج کرنا بھی جائز نہیں۔ بعض لوگوں پر حج فرض نہیں ہوتا اور ان کو حج کی ہوس ہوتی ہے، اس میں بھی نفس اور شیطان کا یہ مکر ہوتا ہے کہ ایک نفل کے پیچھے بہت سے فرض برباد ہوتے ہیں، کیوں کہ بہت لوگ حج کے سفر میں نمازیں چھوڑ دیتے ہیں اور ساتھیوں سے لڑتے جھگڑتے، گالی گلوچ کرتے ہیں، جو بالکل ناجائز ہے۔ اگر ایک شخص نفل حج کا ارادہ کرتا ہو اور اندیشہ یہ ہے کہ سفر میں نمازیں قضا ہوں گی، اس کے لیے حجِ نفل کی اجازت نہیں۔ شریعت نے الاہم فالاہم کے قاعدے کا اتنا لحاظ کیا ہے کہ اہم کی وجہ سے دوسرے واجب اور نفل جو کہ اس کی بنسبت کم اہم ہو، کا ترک واجب کر دیا۔ بعض لوگ حج کو اس غرض سے جاتے ہیں کہ بکری اور تجارت کریں گے۔ حج کو ایسا سمجھتے ہیں، جیسے پیرانِ کلیر اور اجمیر کا عرس، جس کی شان ایک میلے 'تجارت'

سے زیادہ نہیں، تو اگر حج اس واسطے کیا ہے کہ بکری ہوگی، تو حج خراب ہوگیا اور اس کا سارا سفر بکری ہی بکری (تجارت) ہوگیا۔ ایک کوتاہی جو باعتبار تعدیہ مرض کے سب سے اشنع وافبح ہے یعنی سب سے بُری ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ حج کرکے آتے ہیں اور وہاں کے مصاعب اور مصائب (دشواریاں اور تکلیفیں) اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حج کو جانے سے ڈر جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا نہیں تو اور کیا ہے؟ بعض لوگ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے، رشوت وغیرہ کی رقم کو لے کر حج کو جاتے ہیں، کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے، حالاں کہ حرام کمائی کے ساتھ حج قبول نہ ہوگا [گو فرض ہو جائے گا، جیسا کہ گذرا]، اس کا بہت خیال کرنا چاہیے کہ زادِ راحلہ، روپیہ وغیرہ [کچھ بھی] مالِ حرام سے نہ ہو، حلال کمائی ہونی چاہیے۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر حج کو جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اس کو بدل لیتے ہیں، گویا خدا سے بہانہ کرتے ہیں، مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا، بدلین کا حکم ایک ہی ہوتا ہے۔ اس بدلے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی [اس کے حق میں] حرام ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگوں کو افتخار اور اشتہار کی عادت ہو جاتی ہے، جہاں بیٹھتے ہیں، اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں، تاکہ لوگ ان کو حاجی سمجھیں۔ لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ ہم نے سفرِ حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا، مکہ میں اتنا دیا، مدینہ میں اتنا خرچ کیا۔ یقول اھلکت مالاً لبداً۔ حق تعالیٰ کفار کی مذمّت فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کرکے گاتا پھرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیے۔ حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم وتکریم کی خواہش نہ ہونی چاہیے، اس میں تواضع ومسکنت، ذلّت وخواری ہونی چاہیے، یاد رکھو اس افتخار اور اشتہار سے سب کی کرائی محنت اکارت ہو جاتی ہے۔ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر ایک کے ساتھ ہے، نہ معلوم کس وقت آجائے، کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور عوام تو اس کو بہت ضروری سمجھتے ہیں، مگر افسوس کہ کفن ساتھ لے کر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہئیں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا تو چاہیے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت مردہ تصور کرتے اور ساری شیخی اور تکبّر کو یہیں چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمالِ آخرت کے لیے کوشش کرتے، مگر کچھ نہیں، یہ کفن ساتھ لینے کی بھی [بس] ایک رسم ہوگئی ہے۔ بعض لوگ سفرِ حج میں پہلے سے زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں، نماز چھوڑ دیتے ہیں، جماعت کا اہتمام اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑے کرتے ہیں اور حج کرکے اپنے آپ کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں، کیا سفرِ آخرت کی یہی شان ہونی چاہیے؟ بعض لوگ ایسے بے ہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلم بند کرتے ہیں، وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے، اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلم بند کرے کہ دوسروں کا حج آسان ہو جائے گا، تو اس کا مضایقہ نہیں، مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے۔ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں، ویسے ہی حج کے سفر میں رہیں، حالاں کہ سفر میں یک گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی تکلیف ہی نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی، تو سب کلفت رفع ہو جاتی ہے، اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا۔ بعض لوگ سفرِ حج میں پریشان ہو جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور اس کو سفرِ آخرت نہیں سمجھتے، کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، اسی لیے سفر میں جب کوئی بات اپنی شان کے خلاف پیش آتی ہے تو اس سے ناگواری پیدا ہوتی ہے، پھر اسی طرح ایک دوسرے سے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے آپ کو مٹا دے اور عزت وآبرو کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کو سب کا خادم سمجھے، تو یہ باتیں پیش ہی نہ آئیں۔ عموماً حج کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ گھر سے چلتے ہیں یہی خیال کر کے کہ ہماری یوں آؤ بھگت ہوگی، جب ہم لوٹیں گے، لوگ ہم کو حج

کی مبارک باد دینے آئیں گے اور جو مبارک باد دینے نہ آئے، اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ ہم حج کر کے آئے تھے، ہم کو مبارک باد بھی نہ دی انا للہ الخ۔ ارے بھائی تم نے حج کیا تھا تو کیا کمال کیا؟ تمھارے ذمّے فرض تھا، اگر ادا نہ کرتے تو جہنم میں جھونکے جاتے اور نہ معلوم خاتمہ کس حال پر ہوتا، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ پھر بھی حج نہ کرے، تو خدا کو پرواہ نہیں، وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے، تو اگر تم حج نہ کرتے تو ان بلاؤں میں گرفتار ہوتے، پھر کسی پر کیا احسان کیا، جو دوسروں سے مبارک باد ملنے کے منتظر ہو؟ بعض لوگ ریا کرتے ہیں، ریا سے اکثر طاعات کے انوار زائل ہو جاتے ہیں، ثواب جاتا رہتا ہے، اس سے بہت احتیاط کرنا چاہیے اور مستورات تو خصوصاً بہت کرتی ہیں، کیوں کہ ان کو ساری عمر میں ایک بار حج کے لیے گھر سے نکلنا ہوتا ہے، اس کو وہ بہت ہی بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں اور حج کے بعد اگر کوئی ان کو حجّن نہ کہے تو اس پر خفا ہوتی ہیں اور وہاں سے آ کر سب کے سامنے گاتی پھرتی ہیں کہ ہم نے سارے مقامات کی زیارت کی، اگر کسی غریب نے ایک جگہ کی زیارت نہ کی ہو تو اس سے کہتی ہیں کہ تیرا حج ہی کیا ہوا، تو جبلِ نور پر تو گئی نہیں؟ حالاں کہ اصل مقصود عرفات اور بیت اللہ ہے، پھر بیت الرسول، مگر ان کی زیارت تو ہر شخص کرتا ہے، اس لیے ان کو کوئی فضیلت میں بیان نہیں کرتا، ہاں جبلِ نور، غارِ ثور اور امیر حمزہ کا مزار سب گناتی ہیں۔ بعض لوگ صراحتاً اپنے حاجی ہونے کا اگر ذکر نہیں کرتے تو کسی نہ کسی پیرایے میں مخاطب کو بتلاتے ہیں کہ ہم حاجی ہیں۔ ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے تو میزبان نے خادم سے کہا کہ اس صراحی کا پانی لانا، جو ہم دوسرے حج میں ساتھ لائے تھے! مہمان نے کہا کہ حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا۔ چوں کی اس بات میں اس نے یہ بتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے، یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے؟ اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حالاں کہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کا جانا بھی جائز نہیں، اس وجہ سے کہ ان کی نہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے گا، ان کے سامنے تشویق و ترغیب (شوق دلانے والے اور رغبت پیدا کرنے والے) قصّے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیوں کہ اس سے ان کو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں، نہ ظاہری، نہ باطنی، تو خواہ مخواہ وہ دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے، جس سے ناجائز امور کے ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے، اس لیے ایسے لوگوں کے سامنے حج کی تشویق اور ترغیب کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آ کر وہاں کی تکالیف کا حال بیان کرتے ہیں، ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں، چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر واقعی کلفتوں میں اضافہ کر کے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے، وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ حج سے رک جاتے ہیں، اس کا سارا وبال ان لوگوں پر رہتا ہے، جنھوں نے ان کو بہت ڈرایا ہے۔ عام عادت ہے کہ جب کوئی شخص حج کے لیے اپنے گھر سے چلتا ہے تو لوگ پھولوں اور روپیوں کا ہار بنا کر اس کے گلے میں ڈالتے ہیں، جس میں اکثر کی نیت فخر اور شان کی ہوتی ہے، جو کہ شریعت میں ممنوع اور نہایت مذموم ہے اور اگر اس میں ثواب کی نیت کی جاتی ہے تو اور بھی زیادہ قبیح اور برا عمل ہے، جو واجب الترک ہے۔ کسی کو سفرِ حج میں رخصت کرنے کے لیے بہت عورتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں، جو بالکل خلافِ شرع اور سخت منع ہے اور غضب یہ ہے کہ بعض تو مستقل دعوت دے کر مجمع بناتے ہیں، جو کہ ریا و نمود کی دلیل ہے، ان سب کو ترک کرنا چاہیے۔ بعض عورتیں حجّن بننے کی ایسی شوقین ہوتی ہیں کہ سفرِ حج کے لیے کوئی محرم ساتھ ہو یا نہ ہو، بس حج کے لیے ضرور جانا ہے، حالاں کہ حج فرض ہونے کے لیے جہاں اور شرائط ہیں، عورت کے لیے ایک شرط شوہر یا کسی محرم کا سفر میں ساتھ ہونا بھی ہے۔

☆☆☆

❑ قرآنیات

# مکمل قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر کرنے والی خواتین

محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، جو ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، ''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (البقرۃ:۲)۔ شک وہی لوگ کرتے ہیں جن کی قوت بصارت وبصیرت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود رب کائنات نے لے رکھی ہے، ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْن'' ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ونگہبان ہیں (الحجر:۹)۔ یہ ایسی کتاب ہے جو اپنے نزول کے بعد سے رہتی دنیا یعنی قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے آئی ہے۔ دین اسلام کا مطالبہ ہے کہ اس کی تلاوت کی جائے، اس میں غور وفکر کیا جائے، اس سے عبرت ونصیحت حاصل کی جائے اور اس کے مطابق زندگی گزاری جائے۔

قرآن مجید کی اصل زبان چوں کہ عربی ہے اور اس کے مخاطبین عرب وعجم سب ہیں؛ اس لیے مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ قرآن کریم میں غور وفکر کرنے والوں میں مرد حضرات کے ساتھ عورتیں بھی شریک رہی ہیں اور قرآن کی تفہیم وتفسیر میں بھی اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خاص طور پر قرن اول میں حضرت عائشہ صدیقہؓ حدیث کے ساتھ تفسیر کے میدان میں بھی درجۂ امامت پر فائز رہی ہیں۔ اس دور میں اور بھی خواتین کے تفسیری اقوال ملتے ہیں؛ لیکن بعد کے ادوار میں دیگر علمی میدان کے مقابلے میں تفسیر کے میدان میں خواتین کی کوششیں نسبتاً کم رہی ہیں۔ ڈاکٹر عفاف عبدالغفور حمید کے ایک مضمون کا ترجمہ کرتے ہوئے محترمہ ندیم سحر عنبریں تحریر کرتی ہیں کہ:

''تاریخ وتراجم کی کتابوں میں علم تفسیر کے میدان میں خواتین کا بہت کم تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً: ابن سعد کی ''طبقات''، ابن عبدالبر کی ''الاستیعاب''، ابن اثیر کی ''اسد الغابة''، ابن حجر کی ''تہذیب التہذیب''، ''تقریب التہذیب'' اور ''الدرر الکامنة فی اعیان المائة الثامنة'' میں بعض خواتین کا تذکرہ ہے۔ ماضی قریب کی کتابوں میں ایک اسماعیل بغدادی کی ''ہدیة العارفین فی اسماء المؤلفین وآثار المصنفین'' ہے، اس میں دو خواتین کا تذکرہ ہے۔ زرکلی نے ''الاعلام'' میں تیرہ خواتین کا اور عمر رضا کحالہ نے ''اعلام النساء'' میں دس خواتین کا تذکرہ کیا ہے، جن کا تفسیر کے میدان میں کچھ کام ہے۔ ایک کتاب عادل نویہض کی ''معجم المفسرین من صدر الاسلام حتی العصر الحاضر'' دو جلدوں میں ہے؛ لیکن اس میں صرف ایک

مفسرہ کا ذکر ہے، جس کا ذکر اسماعیل بغدادی نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے''۔(سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جلد:۳۳، شمارہ:۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء۔ مضمون: دور جدید کی چند مفسر خواتین، ص:۸۹، ۹۰)۔

ہاں! موجوہ دور میں دینی جامعات، قرآن فہمی کے سرکاری وغیر سرکاری اور دیگر علمی تحقیقی اداروں کے قیام نے قرآنی علوم کی طرف مرد کے ساتھ خواتین کی توجہ بھی مبذول کرائی ہے، جس کے نتیجے میں ایسی خواتین کی ایک بڑی تعداد ہے، جنہوں نے اسلامی علوم بالخصوص تفسیر اور علوم قرآنی میں قابل قدر مقالات تحریر کیے ہیں۔ بعض ایسی بھی ہیں جنہوں نے خاص طور پر قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر اور قرآن سے متعلق مختلف موضوعات پر گراں قدر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

راقم سطور ایک علمی تحقیق وجائزے کے بعد یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ مضامین قرآن، متعلقات قرآن اور بعض قرآنی سورتوں پر خواتین کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں تو موجود ہیں اور مزید علمی کام کسی نہ کسی سطح پر آرہے ہیں؛ لیکن ابھی تک ''مکمل قرآن مجید'' کے جتنے بھی تراجم وتفاسیر کسی بھی زبان میں موجود ہیں، وہ سب تراجم وتفاسیر مرد حضرات ہی کے قلم سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ ہاں! علمی دنیا میں ابھی تک تین ایسی خواتین کے نام اور کام آئے ہیں، جنہوں نے پورے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر پیش کیا ہے، جن میں سے دو کا تعلق عجم سے اور ایک کا عرب سے ہے۔ اللہ تعالی ان کاوشوں کو قبول فرمائے، آمین۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا نام: محمود النسا بیگم کا ہے، دوسرا نام: زینب الغزالی اور تیسرا نام: ثریا شحنہ کا ہے۔ آئندہ سطور میں انہی تینوں خواتین اور ان کی تفاسیر کا تعارف کرایا جائے گا، جو ہمارے اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔

**(۱) محترمہ محمود النساء بیگم- ایک تعارف:** محمود النساء بیگم مرحومہ حیدرآباد، دکن (انڈیا) کی رہنے والی تھیں، ولادت ۱۸۹۸ء میں ہوئی، آپ کے والد سید محمد یوسف الدین گلبرگہ کے صوبہ دار تھے، اور والدہ نجم النساء بیگم حیدرآباد کے جاگیردار خاندان سے تھیں۔ والد صاحب ''نظام حکومت'' میں ایک باوقار عہدے پر فائز تھے، اور انتہائی امانت دار تھے، لوگ کافی عزت واکرام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ امانت داری کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ انہوں نے سرکاری دوات وقلم سے کبھی بھی ذاتی خط وکتابت کا کام نہیں لیا، اردو کے ساتھ ساتھ فارسی وانگریزی زبان سے اچھی طرح واقفیت تھی، انہوں نے اولاد کی بھی تعلیم وتربیت کا اچھا انتظام کیا، باکمال اساتذہ کو رکھ کر تعلیم دلوائی؛ اسی لیے ان کی اولاد اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھی۔

مفسرۂ قرآن محمود النساء بیگم مرحومہ کافی صاحب علم تھیں، ان کے اساتذہ کے نام تو محفوظ نہیں ہیں؛ لیکن ان کے اہل خانہ ان کے علم وفضل کے گواہ ہیں اور قرآن کریم سے ان کے لگاؤ کو بیان کرتے ہیں۔ انہیں عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں دست رس حاصل تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ۱۷/ سال کی عمر میں حسینی بلڈنگ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد کے رہنے والے عبد الغفور ایڈوکیٹ کے صاحب زادے محمد عبد اللہ حسین سے آپ کا نکاح ہوا، آپ ان کی دوسری اہلیہ تھیں۔ شوہر وبیوی میں عمر کا کافی فرق تھا، تقریباً ۱۳/ سال ازدواجی زندگی باقی رہی، ابھی آپ کی عمر ۳۰/ سال ہی ہوئی تھی کہ شوہر نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا اور یہ لاولد ہی رہیں، اپنی ایک بھتیجی خیر النساء بیگم کو منھ بولی بیٹی بنا کر رکھا اور اپنی وفات تک ان کا ہر لحاظ سے مکمل خیال رکھتی رہیں۔ شوہر

کے انتقال کے بعد محمود النساء بیگم نے اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور پوری زندگی ذکر واذکار، تلاوت قرآن اور قرآن کے ترجمہ وتفسیر ہی میں اپنے آپ کو مشغول رکھا۔ یہاں تک کہ ماہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں وقت موعود آ پہنچا اور اپنے رب سے جاملیں، تدفین حسینی علم بلڈنگ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد میں ہوئی۔

مرحومہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اور بچپن ہی سے کافی باحیا تھیں۔ شرافت وسخاوت، دینی مزاج اور ایمان داری و امانت داری وراثت میں ملی تھی۔ رشتہ داروں کا کافی خیال رکھتی تھیں، شوہر کی جانب سے وراثت میں کافی جائیداد ملی تھی، سب غریب رشتہ داروں اور ضرورت مندوں کو دے دی، اپنی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالی نے فن طب سے اچھی واقفیت عنایت کی تھی، دوا سازی کا کام بھی جانتی تھیں، خصوصاً ان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ٹی بی (T.B)، جذام اور حیضہ کی دوائیں کافی مؤثر ہوا کرتی تھیں۔ غربا ومساکین کا مفت علاج کرتی تھیں۔ کئی بار حج کی سعادت سے بھی اللہ تعالیٰ نے بہرہ ور فرمایا، عرب ممالک میں حجاز مقدس کے علاوہ عراق، شام اور فلسطین کے بھی سفر کا موقع ملا۔

محترمہ کی دلی خواہش تھی کہ لوگ قرآن سمجھ کر پڑھیں اور اس پر عمل کریں، اسے صرف طاقوں میں سجا کر، آنکھوں سے لگا کر اور حریر وریشم کے جزدان میں حفاظت سے رکھ کر محبت کا ثبوت نہ دیں؛ بلکہ خود عمل کریں اور لوگوں کو بھی عمل کی تلقین کریں، اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لیے مختلف تراجم وتفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے اسلوب وانداز میں، چند سالوں کی محنت کے بعد ۱۹۴۳ء میں مکمل قرآن مجید کا آسان ترجمہ اور مختصر تفسیر بھی محض اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مکمل کر لی اور اس کا نام ''تفسیر قرآن مجید مع ترجمہ، احکام قرآن بہ اردو'' رکھا؛ لیکن سرورق پر اپنا نام مترجمہ یا مفسرہ کی حیثیت سے نہیں تحریر کیا؛ بلکہ اپنے آپ کو سرورق پر 'مرتبہ' لکھا اور اپنی زندگی ہی میں Govt printing press Hyd سے کئی سو نسخے چھپوا کر مفت تقسیم بھی کیے۔ سب ٹائٹل پر تفسیر کے نام کے بعد ''مطبوعہ دارالطبع سرکار عالی'' لکھا ہوا ہے۔

راقم سطور کی تحقیق کے مطابق اسلامی تاریخ کی یہ پہلی خاتون ہیں، جنھیں محض اللہ تعالی کے فضل وکرم سے خواتین کی صف میں مکمل قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کرنے کے لحاظ سے ''اولیت'' کا شرف حاصل ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کی اس بے لوث خدمت کو قبول فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے، آمین۔

**ترجمہ وتفسیر لکھنے کی اصل وجہ :**

اس ترجمہ وتفسیر کو مؤلفہ مرحومہ نے کس جذبے کے تحت تحریر کیا ہے اور اس کی طباعت کے کیا محرکات تھے؟ اسے آپ مؤلفہ کے مقدمے میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں، جو تفسیر کے شروع میں درج ہے۔ ہاں! میں اتنی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ترجمہ وتفسیر کی پہلی طباعت عربی متن قرآنی کے بغیر ہوئی تھی، صرف ترجمۂ قرآن کو قرآن کی شکل میں شائع کیا گیا تھا اور ورق کے کنارے حاشیہ نمبر ڈال کر تفسیری فوائد لکھے گئے تھے، جیسا کہ ہم عموماً قدیم مطبوعہ کتابوں میں پاتے ہیں۔ اس کی وجہ خود مؤلفہ نے اپنے مقدمہ میں یوں درج کی ہے:

''عربی نہ سمجھنے والوں کے لیے با ترجمہ قرآن شریف بہت ہیں، مگر عربی کے احترام کی وجہ سے ہر کس وناکس کا ان کو چھونا یا پڑھنا، یا بے محل حمل ونقل، بے ادبی سے خالی نہیں، بے تکلفی سے ہر شخص پڑھ نہیں سکتا، دنیوی امور میں سینکڑوں دشوار گزار

راستے انسان چلتا ہے؛ لیکن مذہبی امور میں ذرا سی مشکل مل جائے تو حیلہ جوئی کرتا ہے؛ اس لیے آسان سے آسان تر طریقہ سے مسلمانوں کی سمجھ میں اپنا مذہب آجائے، بس یہی گنہگار کا مقصد ہے۔ محض ان سہولتوں کا لحاظ کرتے اور نہ پڑھنے کے عذرات کو دور کرنے کی غرض سے یہ ترجمہ لکھا گیا ہے..... چنانچہ اس کی اشاعت کے جواز کا فتوی دارالقضاء ودار الافتاء دارالعلوم قادریہ عالیہ بدایوں سے حاصل کیا گیا ہے''۔ (مقدمہ مؤلفہ، بعنوان ''تمہید'')۔

**ایک وضاحت:**

متن قرآنی کے بغیر ترجمہ وتفسیر کی اشاعت کا یہ انداز تحریری اجازت حاصل کرنے کے بعد اختیار کیا گیا تھا، جیسا کہ سطور بالا میں وضاحت کی گئی ہے؛ لیکن اس سلسلے میں صحیح بات یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک قرآنی متن کے بغیر صرف ترجمہ قرآن کو شائع کرنا جائز نہیں ہے۔ احقر نے برصغیر ہند وپاک کے مایۂ ناز ادارہ ازہر ہند ''دارالعلوم دیوبند'' سے فتوی منگوایا ہے، جس میں باجماع امت اس فعل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور حوالے کے طور پر ''جواہر الفقہ ۲/ ۱۲۵، ۲/ ۱۰۶، زکریا'' کا نام لکھا گیا ہے۔ جو فتوی نمبر: ''۱۱۶۸/ ۹۳۷/ د'' ہے، اور ابھی حال ہی میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا چوبیسواں فقہی سمینار مورخہ ۹ تا ۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ مطابق یکم تا ۳/ مارچ ۲۰۱۵ء کو دارالعلوم الاسلامیہ اوچیرہ، کولم (کیرلا) میں منعقد ہوا۔ جس میں قرآن کے متن وترجمہ کی کتابت واشاعت سے متعلق تجاویز میں متفقہ طور پر یہ بات کہی گئی کہ:

''متن قرآن کے بغیر کسی بھی زبان میں تنہا ترجمۂ قرآن کی اشاعت ناجائز ہے، لہذا اسے خریدنا، تقسیم کرنا، ہدیہ کرنا درست نہیں ہے''۔

**محترمہ محمود النساء بیگم کی تفسیر اور اس کا منہج:** قابل مبارکباد ہیں محترمہ محمود النساء بیگم جنھیں اللہ تعالی نے عالم خواتین میں اس شرف وعظمت کے لیے منتخب فرمایا اور ''اوّلیت'' کا مقام عنایت کیا۔ پہلی طباعت میں اس ترجمہ وتفسیر کا نام ''تفسیر قرآن مجید مع ترجمہ، احکام قرآن بہ اردو'' ہے، جو ایک جلد میں، کل ۶۲۱ صفحات پر مشتمل ہے، ترجمہ وتفسیر کے آغاز سے قبل ۴ صفحات ہیں، جن میں ٹائٹل، سب ٹائٹل اور دو صفحات میں مصنفہ کی تحریر بعنوان ''تمہید'' ہے۔ ذیل میں اس تفسیر کے خصائص اور اس کا منہج بیان کیا جارہا ہے۔

(۱) اس تفسیر کا ایک امتیازی پہلو یہی ہے کہ علم وادب کی دنیا میں کسی خاتون کے قلم سے نکلنے والا یہ سب سے پہلا مکمل ترجمہ و تفسیر ہے، جس کی تکمیل ''۴/ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ'' میں ہوئی ہے۔ یہ تاریخ ترجمۂ قرآن کی طبع اول کے آخری صفحہ: ۶۲۱ پر سورۂ ناس کے ترجمہ کے بعد، دعائے قرآن سے پہلے درج ہے۔

(۲) مؤلفہ نے قرآن کے ترجمہ وتفسیر کے لیے اپنے علم ومطالعہ کے علاوہ بنیادی طور پر جن تراجم وتفاسیر سے استفادہ کیا ہے، ان میں شاہ عبد القادر دہلویؒ کی تفسیر ''موضح قرآن'' اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ وتفسیر ہے۔ جو ''تفسیر عثمانی'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ اس بات کا اظہار خود مؤلفہ نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے اور ہر فن میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعد والے پہلے والوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ بالخصوص قرآن مجید کے تمام اردو مترجمین نے شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ ہی کے ترجمہ کو اساس بنا کر استفادہ کیا ہے، خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔

(۳) یہ ترجمہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بامحاورہ ہے۔ اس

میں ایک نرالا انداز یہ ہے کہ انہوں نے دوران ترجمہ جگہ جگہ بین القوسین بہت عمدہ وضاحت پیش کی ہے، جو انداز عموماً قدیم مترجمین کے یہاں کثرت سے نہیں ملتا ہے۔ ترجمہ آسان اور حواشی مختصر ہیں، اگر ترجمہ سے صرف قوسین، یعنی یہ علامت ( ) ہٹادی جائے، اس کے درمیان کی عبارت نہیں، تو اس ترجمہ کو قرآن کی بہترین ترجمانی کا نام بھی دینا بجا ہوگا۔

بعض جگہوں پر اردو محاورے سے بھی ترجمہ کیا گیا ہے، مثلاً : ایک جگہ ہے ''رفو چکر ہوجائے گا''۔ ایک دوسری جگہ ہے ''باتیں نہ بناؤ'' وغیرہ۔ اور کہیں کہیں معنی کی وضاحت کے لیے ضمائر کا ترجمہ اسم ظاہر سے بھی کیا گیا ہے۔ یہ ترجمۂ قرآن خود مؤلفہ کا کیا ہوا ہے اور جس زمانہ میں یہ کام کیا گیا تھا اس زمانہ کی زبان و بیان کے لحاظ سے یہ بہت عمدہ ترجمہ ہے۔ جس کا اندازہ ہر پڑھنے والے کو ضرور ہوگا۔

(۴) جہاں تک محترمہ محمود النساء بیگم کے تفسیری حواشی کی بات ہے، تو احقر کے تجزیے اور مطالعہ کے مطابق یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تقریباً ۲۵ تا ۳۰ فیصد حواشی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ترجمۂ قرآن کے حواشی سے ماخوذ ہیں، جنھیں ''تفسیر عثمانی'' کہا جاتا ہے۔ کہیں تو بعینہ ؛ لیکن اکثر جگہوں پر کچھ حذف واضافہ کے ساتھ، ۵ تا ۱۰ فیصد وہ تفسیری فوائد ہیں، جنھیں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ وتفسیر ''موضح قرآن'' سے اخذ کیا گیا ہے، کہیں تو بعینہ اور کہیں حذف واضافہ کے ساتھ۔ ہاں! تقریباً ۶۰ تا ۷۰ فیصد یعنی نصف قرآن سے زائد وہ تفسیری حواشی ہیں، جن کو مؤلفہ نے کسی مخصوص کتاب کو مرجع بنا کر درج نہیں کیا ہے؛ بلکہ اردو وعربی کی مختلف تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے انداز میں اپنے نوک قلم سے تحریر کیا ہے۔

(۵) ترجمہ وتفسیر کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ معتبر روایات ہی درج کی گئی ہیں۔ فقہی مباحث سے کلیتاً گریز کیا گیا ہے۔ متقدمین ومتاخرین کی تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے، یہ ترجمہ وتفسیر ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے مفید ہے۔ نمونہ کے طور پر بسملہ کے ساتھ سورۂ فاتحہ کا صرف ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، جو تمام جہان کا پالنے والا، بے حد مہربان، نہایت رحم والا، روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل فرمایا، ان کا نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے''۔

یہ ترجمہ وتفسیر جس کا اصل نام ''تفسیر قرآن مجید مع ترجمہ، احکام قرآن بہ اردو'' ہے، ہندوستان کے مرکزی کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں ہے، چہ جائے کہ عام کتب خانوں کی بات کی جائے، شاید طباعت کے بعد اسے عام کرنے کی جیسی کوشش کرنی چاہیے تھی ویسی نہیں کی گئی۔ بس کیف ما اتفق اسے تقسیم کردیا گیا۔ مؤلفہ مرحومہ کے گھر، رشتہ داروں اور خاص افراد کے پاس بھی اس تفسیر کے چند ہی نسخے ہیں۔ راقم سطور کو بعض واسطوں سے اس تفسیر کا ایک نسخہ ملا، اور اس کے ساتھ ہی اس کی تحقیق وتعلیق اور تصحیح کرکے جدید پیرہن میں لانے کے لیے کچھ مخلصین کا کافی اصرار ہوا، جس کا انکار کرنا اس ناچیز کے لیے مشکل ہوگیا، نیز اس کو سعادت سمجھتے ہوئے اللہ کے نام سے کام کا آغاز کیا گیا، اور جدید طباعت کے لحاظ سے اس کا نام ''آسان ترجمہ وتفسیر قرآن مجید'' تجویز کیا گیا۔ تحقیق وتعلیق کے ساتھ متن قرآنی اور ترجمہ وحواشی کی کمپوزنگ ہوچکی ہے، تصحیح

اور سٹنگ کے مرحلے میں کام چل رہا ہے۔ اللہ کرے کہ طبع ہو کر جلد منظر پر آجائے، اور بنی نوع انساں کے لیے مفید سے مفید تر ثابت ہو، آمین۔

**(۲) محترمہ زینب الغزالی-ایک تعارف :**

زینب الغزالی سرزمین مصر کی ایک عظیم داعیہ ومجاہدہ تھیں، پورا نام زینب محمد الغزالی الجبیلی ہے، ولادت سرزمین مصر کے ضلع بحیرہ کے ایک گاؤں میں جنوری ۱۹۱۷ء میں ہوئی، نسب کے اعتبار سے نجیب الطرفین ہیں، والد کی جانب سے سلسلۂ نسب حضرت عمر بن خطابؓ تک اور والدہ کی جانب سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد علمائے ازہر میں تھے۔ انھوں نے اپنی بچی کی بہت اچھی دینی تربیت کی۔ وہ ان کے سامنے نامور صحابیات کے واقعات بہت اثر انگیز انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ جن کا کافی اثر زینب الغزالی پر ہوا اور ان کی زندگی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صحابیاتؓ کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ ابھی ان کی عمر گیارہ سال ہی کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

زینب الغزالی نے ابتدائی تعلیم والد محترم سے پائی، اس کے بعد سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر علمائے ازہر سے بھی کسبِ فیض کیا۔ ان کے اساتذہ میں شیخ عبدالمجید اللبان، شیخ محمد سلیمان النجار اور شیخ علی محفوظ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ابتدا میں زینب الغزالی کا تعلق مصر میں آزادئ نسواں کی علم بردار مشہور خاتون ہدیٰ شعراوی کی قائم کردہ تنظیم ''الاتحاد النسائی'' سے ہوگیا تھا، جو آزادئ نسواں کے میدان میں بہت سرگرم تھی؛ لیکن جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہوگئیں اور خود انھوں نے ۱۹۳۷ء میں ''جمعیة السیدات المسلمات'' کے نام سے خواتین کی ایک تنظیم قائم کی، جب کہ ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ اس تنظیم نے مصری خواتین کی دینی تربیت واصلاح کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں۔ پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم تھیں۔ ''السیدات المسلمات'' کے نام سے اس کا ایک مجلّہ بھی نکلتا تھا، جو خواتین کے درمیان کافی مقبول تھا۔ اس تنظیم سے وابستہ خواتین کی تعداد تقریباً تیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ زینب الغزالی بذات خود مسجد ابن طولون میں ہر ہفتہ خواتین کے درمیان قرآن مجید کا درس دیا کرتی تھیں، جس میں ایک اندازے کے مطابق عموماً تین ہزار سے پانچ ہزار تک خواتین شریک ہوتی تھیں۔ انہوں نے بہت سارے مسلم اور عربی ممالک کے اسفار بھی کیے اور وہاں دینی موضوعات پر محاضرات یعنی لکچرس بھی دیے۔

زینب الغزالی کے زمانے میں سرزمین مصر میں ''الاخوان المسلمون'' نام سے ایک تحریک ابھری، جس کے بانی حسن البنا شہیدؒ تھے، اللہ تعالیٰ نے اس تنظیم کو بالخصوص نوجوانوں کے درمیان کافی مقبولیت عطا کی، زینب الغزالی اس فکر سے کافی متاثر ہوئیں اور انہوں نے اپنی تنظیم ''جمعیة السیدات المسلمات'' کو ختم کردیا، یا یہ کہا جائے کہ اسے ''الاخوان المسلمون'' کے ساتھ ضم کردیا اور بعد میں ''اخوان'' کے شعبۂ خواتین ''الاخوات المسلمات'' کی ذمہ داری انہوں نے ہی سنبھال لی۔ یہ بات بھی لکھی گئی ہے کہ حسن البنا شہیدؒ نے اپنی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے موصوفہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی علیحدہ تنظیم باقی رکھیں، تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۸ء میں ''الاخوان المسلمون'' کو جب خلافِ قانون قرار دیا گیا اور شاہ فاروق کے ظلم وبربریت کے بعد جب ۱۹۵۴ء میں جمال عبد

الناصر کے عہد حکومت میں ''اخوان'' پر دوبارہ کاری ضرب لگائی گئی تو ایسے پرخطر حالات میں ''جمعیة السیدات المسلمات ''ہی واحد تنظیم تھی جو میدان میں سرگرم عمل تھی اور جیل کی سلاخوں میں بند کارکنان ''اخوان'' کے خاندانوں کو سہارا دے رہی تھی۔ اس وقت پورے مصر میں اس تنظیم کی ایک سو بیس شاخیں تھیں۔ آخرکار جمال عبدالناصر نے ۱۹۶۴ء میں ''السیدات المسلمات ''تنظیم پر بھی پابندی عائد کردی، اب کیا تھا؟ زینب الغزالی کو داخلِ زنداں کردیا گیا۔ جیل میں ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، تشدد وایذا رسانی کا ہر حربہ استعمال کیا گیا؛ لیکن قربان جایئے ان کے پائے استقامت پر، اللہ کے فضل وکرم سے وہ صبر وعزیمت کا پہاڑ بنی رہیں اور ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ انھیں پچیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، مگر چھ سال کے بعد انورالسادات کے زمانۂ صدارت میں رہائی مل گئی، ان کا انتقال ۳/ اگست ۲۰۰۵ء میں ہوا۔ اللہ غریق رحمت کرے، آمین۔

زینب الغزالی نے پس دیوارِ زنداں کی یادوں کو قیدِ تحریر میں لانے کے لیے عربی زبان میں ''ایام من حیاتی '' کے نام سے ایک جیل ڈائری بھی لکھی، جو ایک تاریخی کتاب کے ساتھ ساتھ ادب کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے، اس کا اردو ترجمہ ''زنداں کے شب وروز'' کے نام سے ہوا ہے۔ زینب الغزالی نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں؛ جن میں ''ایام من حیاتی'' کے علاوہ ''ابنتی''، ''مشکلات الشباب والفتیات فی مرحلة المراهقة''، ''نظرات فی الدین والحیاة''، ''شرح الاربعین النوویة'' اور ''نظرات فی کتاب الله ''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

**محترمہ زینب الغزالی کی تفسیر اور اس کا منہج**: زینب الغزالی کے علمی کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت ان کی تفسیر کو حاصل ہے۔ اس کا شمار بیسویں صدی عیسوی میں دعوتی وتحریکی اسلوب میں لکھی جانے والی اہم تفسیروں میں ہوتا ہے۔ جو عربی زبان میں ہے۔ جیل ہی میں آپ نے قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر لکھی اور بعد میں اسے مکمل کیا، جس کا نام ''نظرات فی کتاب الله '' ہے، یہ تفسیر عربی زبان میں ہے، جس کی پہلی جلد جامعہ ازہر کے استاذِ تفسیر ڈاکٹر فرماوی کے مراجعہ کے بعد ۷۱۱/صفحات میں سورۂ ابراہیم تک مکمل ہوکر دارالشروق قاہرہ سے ۱۹۹۴ء مطابق ۱۴۱۴ھ میں شائع ہوئی تھی، ابھی حال ہی میں مکمل تفسیر ۱۳۰۰/صفحات میں دارالتوزیع والنشر الاسلامی قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس تفسیر کے بارے میں بعض مضمون نگاروں نے یہ بات لکھی ہے کہ: ''غالباً یہ کسی خاتون کے قلم سے لکھی جانے والی واحد مکمل تفسیر ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ شرف اور کسی خاتون کو حاصل نہیں ہوا ہے''؛ لیکن در اصل اس میدان میں اوّلیت ''محمود النساء بیگم'' کو حاصل ہے، جن کا تذکرہ ابھی سطور بالا میں گذرا ہے۔ زینب الغزالی کا اس میدان میں دوسرا نام ہے۔ ہاں! عربی زبان میں مکمل ترجمہ وتفسیر تحریر کرنے والی یہ پہلی خاتون ہیں۔

مفسرۂ قرآن زینب الغزالی نے اپنی تفسیر ''نظرات فی القرآن ''میں جو منہج اختیار کیا ہے، اسے ہم درج ذیل نکات کی صورت میں یوں بیان کرسکتے ہیں۔

(۱) انہوں نے متقدمین کی ماثور کتب تفاسیر مثلاً: تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر ابی السعود وغیرہ پر اعتماد کیا ہے، جدید تفاسیر میں تفسیر آلوسی، تفسیر قاسمی اور فی ظلال القرآن سے استفادہ کیا

گیا ہے۔ بعض جگہوں میں تفسیر رازی بھی ان کے پیش نظر رہی ہے۔ انہوں نے مشائخ ازہر سے کسب فیض کیا تھا؛ اس لیے کہیں کہیں اپنے ان اساتذہ کے بھی حوالے دیتی ہیں۔

(۲) یہ تفسیر، تفسیر ماثور کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ آیتوں کی تفسیر میں اس مضمون کی دیگر آیتوں کو پیش کیا جائے اور صحیح احادیث، صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور علمائے اسلافؒ کے اقوال سے استدلال کیا جائے۔

(۳) کسی بھی سورت کی تفسیر کے آغاز میں، اس کے مکی ومدنی ہونے کو ذکر کیا جاتا ہے، اس کی آیتوں کی تعداد اور اس کے فضائل بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ عموماً سورتوں کے سبب نزول کے سلسلے میں جو صحیح روایتیں ہیں، انہیں بھی بیان کیا جاتا ہے، مثلاً: سورۂ آل عمران کے شروع میں وفد نجران کی آمد، ان کا نبی سے مناظرہ کرنا اور پھر نبی کا انہیں دعوت مباہلہ دینا، ان سب کو ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) اس تفسیر میں عموماً لغوی تحقیقات، تاریخی تفصیلات اور فقہی اختلافات سے گریز کیا گیا ہے۔ آیات کے عام مفہوم پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ہاں! حروف مقطعات کے ضمن میں انہوں نے اعجاز قرآن کی جانب توجہ دلائی ہے، اور تقریب معنی کے لیے مثالیں دی ہیں اور تشبیہات بھی پیش کی ہیں۔ حروف مقطعات کے سلسلے میں علما کے مختلف اقوال بیان کرنے کے بعد سید قطب شہیدؒ کا قول قبول کیا ہے کہ یہ تحدی اور اعجاز کے لیے آئے ہیں۔

(۵) آیات قرآنیہ کی تفسیر کو حالات حاضرہ سے جوڑ کر بات کی گئی ہے، مثلاً: زکاۃ وانفاق والی آیات کی تفسیر کے دوران اس سلسلے میں مسلم سماج کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی، سودی نظام کو بیان کرتے ہوئے اس پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ ذرا سورۂ بقرہ کی آیات (۲۶۱۔۲۷۷) دیکھیے، اسی دوران محترمہ رقم طراز ہیں کہ:

''ہمارے درمیان اب فریضۂ زکوٰۃ کی ادائی میں بہت زیادہ لاپروائی ہونے لگی ہے اور یہ چند نیک لوگوں کا انفرادی عمل بن کر رہ گیا ہے، جسے وہ کھلے یا چھپے انجام دیتے ہیں اور سود پر مبنی نظام کی تاریکیاں سماج میں چھا گئی ہیں، جن میں لوگ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور اس کے کڑوے کسیلے پھل کھا رہے ہیں''۔

عورتوں کے حقوق کا دفاع کیا گیا ہے اور غلط رسوم ورواج کو چھوڑنے کی دعوت دی گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ قرآن نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ انہیں ملنے چاہئیں۔

(۶) حقیقت میں اس تفسیر کا اصل رنگ دعوتی ہے؛ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آیات قرآنیہ کی تشریح وتوضیح میں دعوتی پہلو کو نمایاں کرتی ہیں اور ایک اچھے سماج کی تشکیل کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ فرد کی اصلاح وتربیت، خاندان اور سماج کی صالح بنیادوں پر تعمیر اور امت مسلمہ کی تشکیل کا پہلو کبھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ گزشتہ قوموں کے واقعات اور خاص طور پر اہل کتاب سے متعلق آیات کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے درس وعبرت کے پہلو کو ضرور نمایاں کرتی ہیں۔ سورہ مائدہ آیت نمبر: ۴۴ کے تحت لکھتی ہیں:

''یہ آیت بنی اسرائیل کے سیاق میں ہے۔ یہاں ہمیں تھوڑی دیر رک کر سوچنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالی نے جو احکام نازل کیے تھے، ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اس نے ان پر کفر کا حکم لگایا تھا، تو امت مسلمہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کرے گی تو کیا اس کے بارے میں یہ حکم نہ ہوگا''۔

(۷) دعوتی اور ادبی پہلوؤں میں زینب الغزالی کی اس

تفسیر کو سید قطب شہیدؒ کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' سے کافی یکسانیت ہے، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دونوں ایک ہی تحریک سے منسلک تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ زینب الغزالی نے ان کی تفسیر سے استفادہ کیا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بھی بالکل صحیح ہوگا کہ انہوں نے دعوت اسلامی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اور وہ اسلامی و ایمانی سماج کی تشکیل کے لیے کوشاں تھیں؛ اسی لیے انہوں نے دعوتی پہلو والی آیات کو اچھی طرح اپنا موضوع بحث بنایا۔

اللہ تعالی زینب الغزالی کو جزائے خیر عطا فرمائے۔انھوں نے فہم قرآن کے میدان میں ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ کاش کوئی باہمت نوجوان اس تفسیر کا اردو ترجمہ کردے، تاکہ اردو خواں طبقہ بھی اس سے بہ آسانی استفادہ کر سکے۔

**(۳) محترمہ ثریا شحنہ-ایک تعارف:**

محترمہ ثریا شحنہ صوبہ کرناٹک کے ضلع یادگیر کے مشہور و معروف خاندان ''شحنہ'' کی چشم و چراغ ہیں، وہیں تعلقہ: شورا پور، موضع: تما پور کی باشندہ ہیں، ایک زمانے میں یہ پورا علاقہ پہلے حیدرآباد، دکن کا حصہ تھا۔ محترمہ ثریا شحنہ کی ولادت ۵/ مارچ ۱۹۴۱ء میں ہوئی، ابھی بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی کے ساتھ درازئ عمر نصیب فرمائے، آمین۔ آپ کے والد کا نام عبدالحی دبیرؒ ہے۔ جو عربی و فارسی کے بہترین استاد تھے، تقریباً تیس سال تک سرکاری ادارے میں بحیثیت مدرس خدمات انجام دیں۔'دبیر' جوان کی نسبت ہے، وہ اصل میں عربی زبان و ادب کے ایم، اے کے مساوی ڈگری تھی، جو پنجاب یونیورسٹی سے جاری ہوتی تھی۔ مفسرہ کی والدہ کا نام ظہور النساء بیگم ہے۔اور شوہر کا نام عبدالواحد ہے، جو تماپور کے رہنے والے ہیں۔

محترمہ ثریا شحنہ بچپن ہی سے علم سے محبت کرنے والی تھیں، گھریلو تعلیم کے علاوہ ان کی ابتدائی تعلیم یادگیر، حیدرآباد، رائچور اور گلبرگہ میں ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں اعلیٰ نمبرات کے ساتھ اردو میڈیم اسکول سے میٹرک میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں جب شادی ہوئی، تو تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا؛ لیکن حصول علم کے شوق نے مہمیز کا کام کیا اور وہ مستقل علمی کاموں میں مشغول رہیں، اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے کوشاں رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء میں اوپن یونیورسٹی میسور سے اردو میں ایم، اے کیا، جس میں سکنڈ زبان عربی تھی۔ مفسرہ صاحبہ علم کی نشر و اشاعت میں تقریباً چار دہوں سے مستقل طور پر مشغول ہیں۔ خواتین کے درمیان وعظ و نصیحت اور ان کی اصلاح کے لیے آپ شروع ہی سے کوشاں ہی ہیں، خطابت و تقریر کے میدان سے آپ کو والہانہ محبت رہی ہے۔ دور طالب علمی میں آپ شاعری بھی کیا کرتی تھیں، آپ کے اشعار کا مجموعہ جو ہاتھ سے تحریر کردہ ہے، ابھی بھی موجود ہے۔ تفسیر کے علاوہ آپ کی دو تالیف اور بھی ہیں۔ ایک کا نام ''سیرت النبی پر چند تقاریر'' اور دوسرے کا نام ''تنکے یادوں کے'' جو مختصر سی آپ بیتی ہے، اس میں دعوتی و اصلاحی کام کے تعلق سے بعض واقعات درج کیے گئے ہیں۔

آپ شروع سے ہی انتہائی دیندار تھیں اور حلال رزق کا اہتمام کرتی تھیں، شادی کے بعد سب سے پہلے آپ کو اپنے شوہر کی کمائی کھٹکی؛ کیوں کہ وہ ایک وکیل تھے، تو انتہائی حکمت عملی سے اور احتیاط و سمجھداری کے ساتھ شوہر کو وکالت کے پیشہ سے الگ رکھا۔ آپ کی محنت سے گاؤں گھر کا ماحول بدلا اور علم و عمل میں اضافہ ہوا۔ آپ کے تین صاحبزادے اور تین

صاحبزادیاں ہیں۔ ایک صاحبزادے عالم ہیں، جو جامعہ دارالسلام، عمرآباد اور مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں اور ایک صاحبزادے انجنیئر ہیں، یہ دونوں فی الحال ایک زمانے سے بحرین میں مقیم ہیں۔ تیسرے صاحبزادے کمپیوٹر گریجویٹ ہیں، جو اپنے علاقے تماپور ہی میں رہائش پذیر ہیں اور اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی ایک صاحبزادی فوزیہ چودھری کرناٹک اردو اکیڈمی کی چیرمین تھیں، جن کا فروری ۲۰۱۶ء میں انتقال ہوگیا۔

ثریا شحنہ صاحبہ نے ''تبیین القرآن فی تفسیر القرآن'' کے نام سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی ہے، جو جون ۲۰۱۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہے اور بہت سارے مکتبوں میں دستیاب ہے۔ میں نے یہ تفسیر ہدیٰ بکڈپو، حیدرآباد سے قیمتاً خریدی ہے۔ ذیل میں اس کا تعارف پیش ہے۔

**ثریا شحنہ صاحبہ کی تفسیر اور اس کا منہج** : ثریا شحنہ صاحبہ کی تحریر کردہ ترجمہ وتفسیر کا نام ''تبیین القرآن فی تفسیر القرآن'' ہے۔ جس کی زبان اردو ہے۔ سرورق کی اس عبارت کو پڑھنے سے بھی کتاب کا مختصر تعارف ہوجائے گا:

''تبیین القرآن فی تفسیر القرآن، قرآن کریم کا لفظ بہ لفظ آسان اردو ترجمہ اور آیات کی تفسیر صحیح احادیث مبارکہ سے۔ ترجمہ وجمع احادیث: ثریا شحنہ ایم۔اے"۔

تفسیر ایک جلد میں ہے، کل صفحات ۱۳۳۸/ ہیں، سورۂ فاتحہ کے آغاز سے پہلے بغیر نمبر شمار کے بیس صفحات ہیں؛ جن میں ٹائٹل پیج، جملہ حقوق محفوظ، جامعہ دارالسلام، عمرآباد کے دو اساتذہ کے تاثرات اور ایک کی تقریظ ہے۔ اس کے بعد ''عرض ناظر ثانی ومخرج احادیث'' کے عنوان سے مفسرہ کے صاحبزادے نذیر احمد بن عبدالواحد چودھری عمری مدنی کی تحریر ہے، اوران سب کے بعد ''عرض مصنفہ'' کے عنوان سے مفسرہ کا مقدمہ ہے۔ اخیر کے پانچ صفحات میں سورتوں کی فہرست اور قرآنی رموز واوقاف کا بیان ہے۔ طبع اول جون ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ اس تفسیر کے تاثر، تقریظ اور تمہید نگاروں نے بھی اسے کسی خاتون کے قلم سے نکلنے والی پہلی مکمل تفسیر کہا ہے؛ حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق خواتین مفسرہ کی فہرست میں ان کا نام تیسرے نمبر پر ہے۔ ان سے پہلے دو کا تذکرہ اسی مضمون میں آچکا ہے۔ ذیل میں اس تفسیر کی خصوصیات اوراس کے منہج کو پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) ترجمہ نہایت آسان اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ لفظی اور ہو بہو ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے طرز پر تحت اللفظ اور تحت السطور ترجمہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ قرآنی لفظ کا اقرب ترین اردو ترجمہ کیا جائے اور قرآن مجید کی آیات وکلمات کی ترتیب باقی رہے، البتہ ضرورت پڑنے پر تقدیم وتاخیر کی گئی ہے۔ اس ترجمہ پر نظر ثانی ان کے صاحبزادے نذیر احمد بن عبدالواحد چودھری عمری مدنی نے کی ہے۔

(۲) اس تفسیر میں مفسرہ نے ترجمہ کے علاوہ اپنی جانب سے کوئی بات بھی تحریر نہیں کی ہے؛ بلکہ آیت سے متعلق صرف صحیح احادیث کا ترجمہ اردو میں پیش کیا ہے اوراس کے حوالے دیے ہیں۔ جن کی تخریج ان کے صاحبزادے نذیر احمد بن عبد الواحد چودھری عمری مدنی نے کی ہے۔ انداز یوں ہے کہ آیات کی تفسیر کے لیے حاشیہ میں آیت نمبر ڈال کر احادیث نقل کی جاتی ہیں، اگر کسی آیت یا اس کے موضوع سے متعلق ایک سے

زائد احادیث ہیں تو اس کو نمبر شمار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، اور مؤلفہ نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ ہاں! کہیں کہیں حاشیہ میں حدیث کو نقل کرنے سے پہلے آیت کی مناسبت سے عنوان بھی قائم کیا گیا ہے۔

(۳) احادیث کی تخریج میں نذیر احمد بن عبد الواحد چودھری عمری مدنی نے اپنا منہج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہو، تو انہوں نے اسی پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح اگر حدیث کتب اربعہ یعنی سنن ابی داد، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی میں ہے، تو انہوں نے انہیں پر اکتفا کیا ہے اور دیگر کتابوں سے ان کی تخریج نہیں کی سوائے مسند احمد کے اور تخریج کے اختتام پر علامہ البانی کی تصحیح کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اگر کوئی حدیث مذکور الصدر کتابوں میں نہیں ہے، تو انہوں نے دیگر کتب احادیث سے ان کی تخریج کی اور شیخ البانی کی تصحیح کا حوالہ بھی دیا۔

(۴) آغاز کتاب میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ترجمہ کی اشاعت میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیا گیا ہے؛ بلکہ مسلسل پندرہ برس کا عرصہ ثریا شحنہ صاحبہ نے قرآنی ترجمہ کو سیکھنے اور سکھانے میں صرف کیا ہے اور کامیاب طریقے سے سینکڑوں بچیوں کو قرآن سکھایا، تب اپنی اس کاوش کو عامۂ المسلمین تک پہنچانے کی کوشش کی۔

(۵) اس ترجمہ پر نظر ثانی کے دوران اردو تراجم قرآنی کے علاوہ عربی کی معتمد قدیم وجدید تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر تفسیر طبری، تفسیر کشاف، تفسیر ابن کثیر، تفسیر جلالین، تفسیر سعدی، تفسیر جزائری اور التفسیر المیسر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ تینوں خواتین نے اپنی محنت وجستجو اور علمی حوصلے سے یہ ثابت کیا کہ اسلامی علوم وفنون کے فروغ وارتقا میں خواتین کو بھی آگے بڑھنا چاہیے، اگر انسان حوصلہ رکھے تو راہ کے ہر مشکلات آسان ہوتے نظر آئیں گے۔ ہمیں دیگر تفاسیر کے ساتھ مذکورہ تفاسیر سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

**مراجع:**

(۱) مفسرۂ قرآن محمود النساء بیگم صاحبہ کے متعلق بنیادی معلومات ان کی منھ بولی بیٹی اور برادر زادی محترمہ خیر النساء بیگم صاحبہ نے راقم کو فراہم کیں، جو اس خاندان کی بزرگ خاتون ہیں اور ضعیف ہوچکی ہیں، اللہ تعالی صحت وتندرستی کے ساتھ اپنی عافیت میں رکھے، آمین۔ اور ان کی تحریر کردہ تفسیر محترمہ ذکیہ کوثر صاحبہ (زوجہ مولانا سید اکبر الدین قاسمیؒ، وصدر معلّمہ جامعہ ریاض البنات، حیدرآباد) نے مجھے عنایت کی، جسے اچھی طرح پڑھنے، مطالعہ کرنے اور دیکھنے کا موقع ملا۔

(۲) مفسرۂ قرآن زینب الغزالی سے متعلق معلومات بذریعہ انٹرنیٹ حاصل کی گئیں، نیز سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جلد:۳۳، شمارہ:۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء سے استفادہ کیا گیا۔

(۳) مفسرۂ قرآن ثریا شحنہ صاحبہ کے تعارفی کلمات ان کے صاحبزادے مولانا نذیر احمد بن عبد الواحد چودھری عمری مدنی، مقیم بحرین سے جستہ جستہ بذریعہ واٹس اپ موصول ہوئے، اسے ہی جوڑ کر راقم نے مضمون کی شکل دی۔ تفسیری خصوصیات ومنہج کو ان کی تفسیر سے سمجھا گیا اور تقریظ ومقدمے سے استفادہ کیا گیا۔

☆☆☆

❑ تربیت و ارشاد

# صالحین کی صحبت

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی

اللہ رب العزت نے انسان کو بڑے اعزاز کے ساتھ پیدا کیا ہے۔اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے مقام کا تعین کرتے ہوئے فرشتوں کو خبر دی۔وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ''اور تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین نائب بنانے والا ہوں''یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ فی الارض بنایا۔ یہ اتنا عظیم مقام ہے کہ اگر کوئی اس کا تصور کرے اور گہرائی کے ساتھ سوچے تو اسے پتہ چلے گا کہ اللہ کا اس کے اوپر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کو زمین میں اپنا نائب بنایا۔انسان کے مکرم اور قابل احترام ہونے کی بات قرآن مجید میں یوں کہی گئی وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ ''ہم نے اولاد آدم کو مکرم بنایا ہے''ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔مذکورہ تمام آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کو بڑے مقام و مرتبہ کے ساتھ پیدا کیا گیا۔

اگر انسان کی ان صلاحیتوں پر نظر ڈالی جائے جو باری تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں تو بھی پتہ چلتا ہے کہ باری تعالیٰ نے انسان پر بڑے کرم و رحم کا معاملہ کیا ہے۔مثلاً انسان کو دماغ دیا گیا، جس کا استعمال کر کے وہ اچھے اور برے کے درمیان فرق محسوس کر سکتا ہے، اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں تلاش کر سکتا ہے اور جستجو کر سکتا ہے۔انسان کو عقل دی گئی جس کی بنیاد پر وہ اپنے حق میں بہتر فیصلے لے سکتا ہے۔شعور عطا کیا گیا جو انسان کے لیے بڑا قیمتی ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر آگے بڑھنے کی آرزو اور خواہش رکھ دی اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تمنا بھی پیدا کر دی۔اتنی صلاحیتوں اور اوصاف کے ساتھ انسان کو جس جہان میں بھیجا گیا، اس میں مخالف اور منفی طاقتوں کو بھی پیدا کیا گیا جو غلط راستے کی طرف انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔شیطان اور اس کا لشکر ہمیشہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ انسان کو بہکایا اور بھٹکایا جائے۔انسان کو بہکانے اور بھٹکانے کے لیے شیطان اپنی ساری توانائی خرچ کر دیتا ہے اور طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔جس دنیا میں انسان موجود ہے وہاں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو بظاہر بڑی بھلی اور خوشنما معلوم ہوتی ہیں، مگر فی الواقع وہ بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔یہ سب اس لیے پیدا کیا گیا تا کہ انسان کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔

اللہ رب العزت نے انسان کو وہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ اس کا استعمال کر کے صحیح اور غلط کے مابین فرق محسوس کر سکتا ہے، یہ جان سکتا ہے کہ کونسی چیز اس کے لیے کامیابی کی ہے اور کونسی چیز اس کے لیے ناکامی کی ہے، مگر اس کے ساتھ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ رب العزت نے پیغمبروں کو بھی دنیا میں بھیجا اور بڑی تعداد میں بھیجا تا کہ وہ لوگوں

کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کریں، ایسے ہی صحیفوں اور کتابوں کو نازل کیا کہ انسان صراطِ مستقیم پر چلتا رہے اور شیطان کے مکروفریب کا شکار نہ ہو۔ انبیاء علیہم السلام کے سلسلے کے ختم ہوجانے کے بعد علما کو پیدا کردیا کہ وہ ٹھوس بات لوگوں کو بتاتے رہیں اور اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیں۔ علماء کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الْعُلَمَاء وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء ''علماء نبیوں کے وارث ہیں''۔ امت میں اللہ رب العزت نے اولیاء اور صلحا کو بھی پیدا کیا جو خود بھی نیکی کے کام کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی نیکی کے کام کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ سماج کے لوگوں کے لیے بڑے مفید ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی صحبت اختیار کر کے اپنے آپ کو سدھار سکتے ہیں اور صحیح راستے پر قائم رہ سکتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْن (نیکوکاروں کی صحبت اختیار کرو)۔

نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی تاکید اس لیے کی گئی کہ صحبت انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر صحبت غلط لوگوں کی مل جاتی ہے تو ان کے اثرات پڑنے کے خدشات رہتے ہیں اور اگر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کی جاتی ہے تو ان کے اچھے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر بچہ فطرت (فطرتِ اسلام) پر پیدا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے والدین اسے یہودی بنادیتے ہیں، مجوسی بنادیتے ہیں اور نصرانی بنادیتے ہیں۔'' یعنی جو بچہ بھی دنیا میں آتا ہے وہ فطرت اسلام کے ساتھ آتا ہے مگر اپنے والدین اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ویسا ہی بن جاتا ہے۔ اگر اس کے والدین یہودی ہوتے ہیں تو یہودی بن جاتا ہے، اگر عیسائی ہوتے ہیں تو عیسائی بن جاتا ہے، اگر مجوسی ہوتے ہیں تو مجوسی بن جاتا ہے اور مسلمان ہوتے ہیں تو مسلمان بن جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحبت اور ماحول کا کس قدر اثر پڑتا ہے۔ یہ حدیث تمام انسانوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں تاکہ اچھے بن جائیں اور برے لوگوں کی صحبت سے بچیں تاکہ برائی سے محفوظ رہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنی ضروری ہے کہ دنیا میں مختلف مزاج وعادات رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو جرائم کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور پے در پے غلط کام کرتے ہیں، بعض بدعنوانی اور رشوت خوری میں پیش پیش رہتے ہیں، بعض شراب نوشی کی لت رکھتے ہیں، بعض زناکاری کے سمندر میں غرقاب رہتے ہیں، بعض کذب گوئی اور وعدہ خلافی کی عادت رکھتے ہیں، بعض دنیاداری کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور دنیوی عیش وعشرت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے معیار وعادات کے مطابق بات چیت بھی کرتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، ان کے لیے یہ خطرات اور خدشات پیدا ہوجاتے ہیں کہ کہیں ان کی بری عادتیں ان کے اندر نہ آجائیں۔ اس لیے بھی کہ شیطان اپنے مکروفریب کے ساتھ انسان کو بھٹکانے اور بہکانے میں لگا ہوا ہے۔ وہ غلط لوگوں کا ساتھ دیتا ہے اور اچھے لوگوں کو غلط لوگوں کی راہ پر آنے کے لیے اپنا سارا زور لگادیتا ہے۔ شیطان کو اتنی قوت دی گئی ہے کہ وہ انسان کے خون تک میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس کے مکروفریب اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ ان سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے تمثیلی انداز میں شیطان کی قوت کو بیان کرتے ہوئے شیطان کی زبانی یہ کہلوایا ہے۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

انسان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ شیطانی حربوں وحملوں سے چوکنا ہو۔ خود انسان کے اپنے اندر نفسِ امّارہ موجود

ہے جواس کوغلط چیزیں اختیار کرنے پراُکساتا ہے۔بعض اوقات نفسِ امّارہ انسان پراس قدر غالب آجاتا ہے کہ اُسے اپنا اسیر بنالیتا ہے اورانسان بے چون وچرا لمبے وقت تک اس کی اتباع کرتا رہتا ہے۔بعض لوگوں کی تو زندگیاں ہی ختم ہوجاتی ہیں مگر وہ نفسِ امّارہ کے جال سے نہیں نکل پاتے ، کچھ لوگوں کو ایک لمبی مدت تک نفسِ امّارہ کی غلامی کرنے کے بعد احساس ہوتا ہےاوروہ ندامت وپشیمانی کے عالم میں اپنے رب کے حضور دعا گو ہوتے ہیں اورنفسِ امّارہ کی قید سے چھٹکارا پانے کی عاجزانہ درخواست کرتے ہیں۔بقول شاعر۔

کریما بہ بخشائے برحالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

نفسِ امّارہ کی غلامی سے نجات پانے اورشیطانی مکروفریب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی رسّی کومضبوطی سے تھام لیا جائے۔یعنی اللہ سے اپنے تعلق کومضبوط کرلیا جائے۔جن چیزوں کو کرنے کا باری تعالیٰ نے حکم کیا ہے ، وہ چیزیں کی جائیں اورجن چیزوں سے روکا ہے،ان سے بچا جائے۔اللہ رب العزت نے ارشادفرمایا: اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡل۔احکامِ الٰہی اوراسوۂ نبیؐ کواختیار کرکے انسان اپنے آپ کوسیدھے راستے پرگامزن رکھ سکتا ہے۔اللہ کے ارشاد کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡن کے مطابق نیک لوگوں کا ساتھ پکڑلیا جائے۔اسی لیے بہت سے اکابرین نے اولیاءاللہ کی صحبت اختیار کرنے ،ان سے استفادہ کرنے کواہم قرار دیا ہے۔صالح پیرومرشداپنے شاگرد کی اصلاح کرتے ہیں،ان کے اندرتزکیۂ نفس کا جذبہ بیدار کرتے ہیں اوران پرتوجہ رکھتے ہیں۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگرکسی کوصالح پیر یا مردِ کامل مل جائے تو یہ اس کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔مولانا رومی کوشمس تبریز جیسا بزرگ حاصل ہوا تو ان کی زندگی میں زبردست انقلاب آگیا۔اقبالؔ نے کہا ہے۔

گر نیابی صحبت مردِ خبیر
از اب و جد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیق از راہ ساز
از خدا بخشد ترا سوز و گداز

نیک لوگوں کی صحبت کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش وتربیت کے دوران اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے بچے کن لوگوں یا بچوں کے ساتھ وقت گزاررہے ہیں۔اگروہ یہ دیکھیں کہ ان کے بچوں کے گردرہنے والے بچے اچھی خصلت نہیں رکھتے یا ان کے ماحول درست نہیں ہیں تو فوری طور سے انہیں اپنے بچوں کا ماحول تبدیل کرنے کے لیے ایسے بچوں اورلوگوں کی صحبت فراہم کرنی چاہئے جونیک ہوں،مثبت سوچ رکھتے ہوں ۔اس سلسلے میں ذراسی غفلت ان کے بچے کے مستقبل کے لیے تباہ کن ہوسکتی ہے۔ بچوں کو اچھا ماحول دینا شروع سے ہی ضروری ہوتا ہے۔اگرابتدامیں منفی ماحول انہیں مل جاتا ہےاور وہ اس میں رَچ بس جاتے ہیں تو پھراس سے ان کونکالنا آسان نہیں ہوتا۔بچے کورے کاغذ کی مانند ہوتے ہیں ۔جیسا وہ دیکھتے ہیں،سیکھ لیتے ہیں جوکچھ ان کے اردگردہوتا ہے،وہ غیر محسوس طریقے سے ان کی زندگیوں کومتاثر کرتا ہے۔اس بابت غوروفکر کرتے ہوئے والدین سب سے پہلے خود اپنے کردار وعمل کا جائزہ لیں،اپنا محاسبہ کریں اور یہ دیکھیں کہ ان کی زندگی کس طرح کی ہے۔وہ خود نیک ،ایماندار، دیانت دار، اسلام کے پابند ہیں یانہیں۔اگرنہیں ہیں تو پھران کے بچوں کے لیے خطرے کی گھنٹی یہیں سے بجنی شروع ہوجاتی ہے۔کیوں کہ بچے زیادہ ترانہی کے پاس رہتے ہیں۔ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ کہی جاتی ہے۔ یعنی بچہ اپنی ماں کی گود میں بہت کچھ

سیکھتا ہے۔ وہ ماں کو جس طرح کرتے دیکھتا ہے، ویسا ہی کرتا ہے، جیسے ماں بولتی ہے، سکھاتی ہے، ویسے ہی وہ بولتا سیکھتا ہے۔ اب اگر خدانخواستہ ماں کا کردار اچھا نہ ہوا، اس کی سوچ منفی ہوئی، اس کے اعمال غیر مناسب ہوئے، اس کی گفتگو بے ڈھنگی، غیر مہذب اور ناشائستہ ہوئی تو فطری طور پر وہی چیز بچوں کے اندر بھی داخل ہوجائے گی۔ چنانچہ ماں کو بہت زیادہ محتاط ہونا پڑے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اچھا بننا پڑے گا۔ یہی سب کچھ باپ کو بھی کرنا ہے، اس لیے کہ ماں کے بعد بچہ کو باپ سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض والدین خود دیندار، صالح نہیں ہوتے اور غلط کام کرنے سے باز نہیں آتے مگر اپنی اولاد کو نیک وصالح اور ایماندار بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔ اس کے بعد والدین کے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ گھر میں دوسرے افراد اور کون کون ہیں اور وہ کیسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بہت سے گھر متعدد افراد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر گھر کے سبھی ممبران درست ونیک ہیں تو بہت اچھی بات ہے، لیکن اگر کوئی غلط راستے پر ہو تو والدین کی ذمہ داری ہے کہ گھر کے اس فرد کی بھی اصلاح کریں، اگر وہ نیک بن جائے تو بہت اچھی بات، ورنہ تو اپنے بچوں کو اس کی صحبت سے بچانے کی کوشش کریں۔ بچہ جب تھوڑا بڑا ہونے لگتا ہے اور گھر کے باہر نکلنے لگتا ہے تو پھر اس بات پر بھی نظر رکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ گھر کے باہر وہ جن بچوں سے مل رہا ہے وہ کیسے ہیں؟ اگر ان بچوں کا ماحول درست نہیں ہے تو اپنے بچوں کو ان سے بچائیں۔ پھر جب بچے اسکول یا مدرسے جانے کے لائق ہوجائیں تو والدین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ایسے اسکولوں ومدرسوں کا انتخاب کریں جہاں کا ماحول اچھا ہو۔ جہاں ماحول خراب ہو، وہاں ہرگز بچوں کو داخلہ نہ دلائیں۔ کیوں کہ گھر کے بعد بچوں کے لیے مدرسے اور اسکول بڑے اہم ہیں۔ غرض یہ کہ ماحول اور صحبت بچے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس پر اس کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار ہوتا ہے۔

''صحبت'' کی اہمیت صرف بچوں کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ جوانوں کے لیے بھی ہے، بوڑھوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی ہے۔ جوانوں کو بھی نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔ برے لوگوں کی صحبت ان کے لیے بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ جوانی میں انسان کے پاس بھرپور امنگیں ہوتی ہیں، جسم میں طاقت ہوتی ہے، خواہشات زوروں پر رہتی ہیں۔ اگر ایسے میں اسے غلط ماحول اور برے ساتھی مل گئے تو بڑے خطرے کی بات ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ والدین نے اپنے بچوں کو گھر میں بھی اچھا ماحول دیا، باہر بھی اچھے بچوں کے ساتھ انہیں لگایا، اچھے ماحول والے اسکولوں میں داخلہ کرایا مگر جب وہ باہر آئے، عملی دنیا میں قدم رکھا اور کچھ برے نوجوان ساتھی انہیں مل گئے تو وہ بگڑتے چلے گئے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نوجوان اپنے آپ کو نیک لوگوں کے ساتھ جوڑیں۔ بڑھاپے میں اگرچہ انسان عقل کے اعتبار سے بھی پختہ ہوجاتا ہے، امنگیں اور خواہشات بھی دم توڑنے لگتی ہیں، لیکن اگر اس عمر میں بھی غلط ماحول ملتا ہے تو وہ اپنی آخرت سے لاپرواہ ہوکر غیر معیاری کام کرسکتا ہے۔ جس کی ڈھیر ساری مثالیں سامنے ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی اچھی صحبت ناگزیر ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ اچھی اور دیندار عورتوں کے ساتھ رہیں۔ بدچلن عورتوں کے ساتھ رہنا نقصان دہ اور خطرناک ہے۔ بہرکیف صالحین کی صحبت بڑی اہم ہے اور ہر شخص کو چاہئے کہ وہ صالحین کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھے، غلط لوگوں سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

# نئے تعلیمی سال کا آغاز اور ارباب مدارس سے چند گذارشات

مولانا محمد قمر الزماں ندوی

اسلامی تقویم کی ابتداء تو ماہ محرم سے ہوتی ہے، لیکن برصغیر ہندو پاک میں مدارس اسلامیہ کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ماہ شوال المکرّم سے ہوتا ہے، رمضان المبارک کی لمبی وطویل تعطیل کے بعد ماہ شوال کی ابتداء میں ہر چہار جانب سے مدارس اسلامیہ کی طرف طلبہ کا رجوع ہوتا ہے، اور تقریباً ماہ شوال کا اکثر حصہ داخلہ کی کارروائی میں گزر جاتا ہے۔

مدارس اسلامیہ میں نظام تعلیم وتربیت اور داخلہ کی کارروائی میں بے شمار خامیاں اور نقائص ہیں جن میں سے چند کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے، اور ان کمیوں اور خامیوں کے تدارک کے لئے کچھ تجویزیں پیش کی جارہی ہیں۔

(1) اکثر مدارس میں داخلہ کی کارروائی میں تقریباً پورا مہینہ صرف ہوجاتا ہے، طلبہ کی آمد میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے، کچھ طلبہ شوال کے شروع عشرے میں آتے ہیں کچھ طلبہ درمیان شوال میں اور کچھ طلبہ اخیر شوال میں، اس لئے اس میں یکسانیت لانے کی ضرورت ہے۔

(2) جدید وقدیم طلبہ کے داخلہ کی کارروائی ایک ہفتہ میں بلکہ اس سے بھی کم وقت میں آسانی سے ہوسکتی ہے؛ لیکن خواہ مخواہ اس کو طول دیا جاتا ہے- طلبہ کو ہر حال میں مکلّف بنایا جائے کہ وہ وقت مقررہ پر مدرسہ پہنچ جائیں۔

(3) نئے طلبہ کے داخلہ کے لئے جو ٹیسٹ اور امتحان لیا جائے اس میں کسی طرح کی رعایت نہ برتی جائے اور اہلیت ہی کی بنیاد پر مطلوبہ درجہ میں داخلہ لیا جائے۔

(4) تعلقات اور بے جا سفارش کی بنیاد پر کسی بھی طالب علم کو اوپر درجہ میں بغیر استحقاق اور استعداد کے داخل نہ کیا جائے۔

(5) طالب علم سابقہ مدرسہ سے جو تصدیق نامہ لائے اس کی تحقیق کی جائے اور وہاں کے ذمہ داروں سے اطمینان حاصل کرلیا جائے۔

(6) مستحق اور حقدار طلبہ ہی کا غیر مستطیع داخلہ لیا جائے اور اس سلسلے میں پوری چھان بین کی جائے اور ایک نظام مرتب کیا جائے، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم غیر مستطیع داخلہ لے کر مدرسہ میں پڑھ رہا ہے اور اس کے پاس ملٹی میڈیا موبائل ہے جس کی قیمت دس ہزار اور بیس ہزار ہے، اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ قیمتی موبائل استعمال کرتا ہے۔

(7) موبائل کے استعمال پر پابندی ہو اور خبر رسانی اور طلبہ کو ان کے گھریلو حالات اور خیر وخیریت جاننے کے لئے کوئی نعم البدل تلاش کیا جائے، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر ہاسٹل میں لینڈ لائن فون اور چپراسی اور واچ مین کا انتظام کیا جائے، عموماً مدارس میں موبائل کے استعمال پر پابندی جو نہیں لگ پاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا الٹرنیٹ نہیں تلاش کیا جاتا ہے، ایک وجہ اسٹاف اور اساتذہ کے بچے بھی بنتے ہیں جو مخصوص بچوں کے موبائل اپنے گھر میں رکھتے ہیں اور چھپ چھپا کر ان طلبہ کو دیتے رہتے ہیں۔

(8)داخلہ کے نظام کو چوکس اور فعال بنایا جائے اور تاریخ پیدائش کے خانے کو سرکاری آئیڈی اور تاریخ سے ٹیلی کرلیا جائے۔

(9) پورے سال کی چھٹیوں کا نظام اور تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی ترتیب پہلے بنالی جائے اور اس پر عمل کرایا جائے، موسم اور حالات کی وجہ سے اس میں جزوی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

(10) درجہ میں حاضری فیصد اور ثقافتی سرگرمیوں اور پروگراموں میں حاضری فیصد کا چوکس نظام بنایا جائے اور اس پر سختی سے عمل کرایا جائے۔

(11)نظام الساعات والدروس کی ترتیب وسیٹنگ کسی ماہر تجربہ کار اور باصلاحیت استاذ کے سپرد کی جائے جس کو تعلیمی تجربہ اور درس وتدریس کا سلیقہ ہو، اور اساتذہ کی صلاحیت اور ان کے فن سے دلچسپی سے واقف اور آگاہ ہو اور بہتر یہ کہ خود ناظم مدرسہ اور مہتمم مدرسہ اس پر نظر ثانی کریں اور اس کو ملاحظہ کرلیں۔

(12)جس استاذ کو جس فن سے دلچسپی ہو اور جس فن میں اختصاص ہو وہی فن اور مضامین اس کے سپرد کئے جائیں۔ تعلقات اور رابطہ کی بنیاد پر کسی نااہل اور غیر صلاحیت مند استاد کو کوئی کتاب تدریس کے لئے نہ دی جائے۔

(13)اساتذہ کی تقرری میں رشتے ناطے کو نہ نبھایا جائے بلکہ علمی اور تدریسی ملکہ کو ترجیح دی جائے۔ صلاحیت ولیاقت کے ساتھ ان کی صالحیت کو بھی دیکھا جائے، بعض لوگ بہت ذہین ہوتے ہیں لیکن ذہن معتدل اور ہموار نہیں ہوتا ایسے لوگوں سے ان کی صلاحیت کے باوجود مدرسہ کو فائدہ کم، نقصان زیادہ پہنچتا ہے۔ وہ طلبہ کی منفی رہنمائی کرتے ہیں جس سے مدرسہ میں آئے دن ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے۔

(14)ارباب مدارس کو چاہئے کہ وقفہ وقفہ سے اساتذہ کرام سے صلاح ومشورہ کرتے رہیں، نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے ان کی طرف سے جو بہتر اور مفید آراء اور مشورے آئیں ان پر عمل کیا جائے اور ان کی رائے کو اہمیت دی جائے۔

(15)ہر درجہ کے لئے معلم درجہ کا انتخاب کیا جائے اور اس کلاس اور درجہ کی جملہ ذمہ داری اور طلبہ کو بنانے اور سنوارنے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے، اور اس کے لئے معلم درجہ کو تنخواہ کے علاوہ خصوصی الاونس دیا جائے، اور جس درجہ کے طلبہ مدرسہ میں نمایاں کامیابی حاصل کریں اس کلاس کے طلبہ کو اور معلم درجہ کو انعامات طمغہ اور توصیفی اسناد سے نوازا جائے۔

(16)اساتذہ کی ٹریننگ اور ان کے اندر تدریسی گر پیدا کرنے کے لئے ماہرین تعلیم وتربیت کے محاضرات اور ورکشاپ رکھے جائیں۔

(17)نمایاں طلبہ کو سال کے اختتام پر خصوصی انعام دیا جائے۔ اسی طرح ان اساتذہ کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے جنھوں نے کماحقہ تدریسی اور ثقافتی ذمہ داری کو نبھایا اور مدرسے کی شہرت اور نیک نامی کا ذریعہ بنے۔

(18)ہر مدرسہ میں تقریبا کتب خانہ کا نظام ہوتا ہے، کہیں کا کتب خانہ معیاری ہوتا ہے اور کہیں کا غیر معیاری؛ لیکن کتب خانہ عام طور مہمانوں کو دکھانے کے لئے شوپیش کے طور پر ہوتا ہے، کتب سے استفادہ کا مزاج نہ طلبہ میں ہوتا ہے اور نہ اساتذہ میں، الا ماشاء اللہ، بہت سے مدارس کے ذمہ دار تو مالی فراہمی اور دیگر چیزوں میں اتنے مصروف ہوجاتے ہیں کہ کتب خانہ جھانکنے کی بھی ان کو فرصت نہیں ملتی، ارباب مدارس کو چاہئے کہ ان کے اندر بھی کتب بینی کا بھرپور ذوق ہو اور وہ بھی براہ راست کتب خانہ سے استفادہ کریں تاکہ طلبہ اور اساتذہ میں بھی ذوق وشوق پیدا ہو۔

(19)اساتذہ کو معاشی پریشانی اور ذہنی ٹینشن سے آزاد رکھنے کے لئے مناسب لائحہ عمل طے کیا جائے اور وہ اساتذہ جو گھریلو حالات کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں خاموشی سے ان کی مدد کی جائے اور اصحاب ثروت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے کہ وہ ان اساتذہ کا خاموشی سے تعاون کردیا کریں۔

الحمداللہ مجھ سے اس سلسلے میں جو کچھ بن سکتا ہے کرتا ہوں۔

(20) ان اساتذہ کرام کو جو مکمل طور پر تدریس سے جڑے رہتے ہیں ان کو وصولی اور چندہ پر مجبور نہ کیا جائے، ہاں اگر ان کا حلقہ ہے اور وہ اس کے لئے آمادہ ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

(21) رمضان میں چونکہ کئی گنا اخراجات بڑھ جاتے ہیں اس لئے حضرات اساتذہ کے لئے .. رمضان بونس.. کا خصوصی انتظام کیا جائے۔

(22) طلبہ میں آفاقیت اور علمی تبحر اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کے لئے دوران سال مختلف علمی موضوعات پر ماہرین فن علماء اور دانشوروں کے محاضرات رکھے جائیں اور اسلام پر جدید ذہنوں کے اعتراضات پر طلبہ کے درمیان مکالمہ اور مباحثہ کرایا جائے، میں جب ندوہ میں فضیلت سال دوم میں تھا تو اس زمانہ میں ہمارے ساتھیوں نے ایک مباحثہ اور مکالمہ کرایا تھا جس کا عنوان تھا.. یکساں سول کوڈ ملک کے لئے مفید یا غیر مفید؟.. اس مکالمہ کی تیاری کے لئے ایک مہینہ سے زیادہ کا وقت دیا گیا تھا، ہم مفید والی ٹیم میں تھے اور ہمارے قائد بھائی ذکی نور عظیم تھے، مجھے نائب قائد ہونے کا شرف حاصل تھا، ندوہ میں اس مکالمہ کا بڑا چرچا رہا۔ عباسیہ ہال میں حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی مدظلہ العالی کی صدارت میں اس مکالمہ کا انعقاد ہوا اور حکم کے فرائض انجام دے رہے تھے: مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب، پروفیسر انیس چشتی صاحب، مولانا عتیق احمد بستوی صاحب اور مولانا ظفر عالم ندوی صاحب۔ پارلیمنٹی انداز میں سب کو بحث کرنا لازمی تھا ورنہ مسلمانوں کا صاف اور واضح عقیدہ ہے .. ان الدین عند اللہ الاسلام. ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ الخ

مکالمہ بڑا زبردست تھا، فریقین نے زبردست دلائل پیش کئے لیکن میری ٹیم مفید والوں کے دلائل سوئے اتفاق فریق ثانی پر بھاری پڑ گئے اور ہماری ٹیم کی جیت کا اعلان کر دیا گیا، صدر جلسہ کا منشا تھا اور بالکل صحیح منشا اور خواہش تھی کہ ہار جیت کا اعلان نہ کیا جائے بلکہ اس کو مبہم رکھ کر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ فریقین میں سے دونوں کے دلائل مضبوط تھے اور دونوں فریق نے اچھی تیاری کی تھی۔ مفید والوں کا کہنا یہ تھا کہ اسلام خدا کا آخری مذہب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں یہ برادران وطن کی مذہبی کتابوں میں بھی درج ہے اور دیگر آسمانی کتابوں میں کھل کر اس کی وضاحت ہے اور اللہ تعالی نے اس آخری دین کے بارے میں فرمایا الیوم اکملت لکم الخ تو کیوں نہ پوری دنیا میں مذہب اسلام کا قانون نافذ ہو اور سب کے لئے اسلامی قانون لازمی ہو، ہم پوری دنیا میں اسلام کا آخری آسمانی مذہب کے طور پر تعارف کرائیں اور اس کی افادیت کو ثابت کریں۔

خیر اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے پروگرام اور محاضرات سے ہمارے طلبہ کے لئے جدید ذہنوں کے اعتراضات کا جواب دینا آسان ہوگا۔

(23) فرق باطلہ کے تعارف پر طلبہ کو آمادہ کیا جائے، آج علمی پستی اور گراوٹ کا حال یہ ہے کہ طلبہ مدرسہ سے فارغ ہو جاتے ہیں اور ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ قدریہ کیا ہے؟ معتزلہ کیا ہے؟ مرجئہ کیا ہے؟ جہمیہ کیا ہے؟ قادیانیت کیا ہے؟ بابیہ کون سا فرقہ ہے، بہائیہ، اسماعلیہ، صہیونیہ، علمانیہ، کیا ہے؟

ہمارے طلبہ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ علم کلام میں ہم کس کے متبع ہیں امام اشعری کے یا ماتریدی کے؟ اسی طرح عصر حاضر کے جدید گمراہ فرقوں کے سلسلے میں ہمارے طلبہ کی معلومات بھی تنگ ہیں۔ اس لئے ان موضوعات پر محاضرات اور ورکشاپ کرانا نہایت ضروری ہے۔

(24) مدارس میں علمی گراوٹ کی ایک اہم اور بنیادی وجہ ملٹی میڈیا موبائل کا بے لگام استعمال ہے اور ہم اس پر پابندی لگانے میں ہر طرح سے ناکام ہیں اور ہمت ہار گئے ہیں جب کہ یہ بہت مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں ہم گھبراتے ہیں کہ اگر ہم

زیادہ سختی کریں گے تو طلبہ کم ہوجایں گے اور ہمارا ہاسٹل خالی رہ جائے گا۔ بعض طلبہ نے رازدارانہ انداز میں احقر سے آکر کہا کہ مولانا جب تک اس پر پابندی نہیں لگے گی ہم طلبہ کبھی کامیاب اور صلاحیت مند نہیں بن پائیں گے، خدارا اس پر کوئی سخت قانون بنوایئے، ان طلبہ کی وجہ سے کمرہ کا ماحول گندہ رہتا ہے فیس بک اور واٹسپ پر عریاں تصویریں بھی کثرت سے آتی ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کا ذہن منتشر رہتا ہے اور پڑھنے میں ان کی طبیعت نہیں لگتی ہے۔ اور ماحول کا اثر ہم لوگوں پر بھی پڑ رہا ہے، یہ گھر کے فرد کی گواہی ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں ٹھوس اور مضبوط قانون بنانے کی ضرورت ہے۔

(25) دارالاقامہ (ہاسٹل) میں طلبہ کی رہائش اور قیام کے سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے کہ ایک ہی ضلع اور صوبہ کے طلبہ کو ایک کمرہ میں نہ رکھا جائے بلکہ کئی صوبے اور ضلع کے الگ الگ طلبہ کو ایک کمرہ میں جگہ دی جائے تاکہ علاقیت اور عصبیت کا ماحول نہ پنپ سکے اور نہ ہی ایسی باتیں جنم لے سکیں۔ اور نہ ہی علاقائی اور صوبائی بنیاد پر کسی تنظیم، بزم اور تحریک وسوسائٹی بنانے کی اجازت دی جائے۔ الحمداللہ ندوہ کو اس سلسلے میں امتیاز اور تفوق حاصل ہے، میں عالیہ رابعہ میں سلیمانیہ ہاسٹل میں تھا میرے کمرے میں کئی صوبے کے بچے تھے۔ کرناٹک مہاراشٹر، یوپی، آندھراپردیش، بہار اور مغربی بنگال، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ دوسرے صوبے کے کلچر اور وہاں کی تہذیب وثقافت بود و باش اور خورد ونوش سے بھی واقف ہوجاتے ہیں۔ نیز علاقیت اور عصبیت کا ماحول جنم نہیں لے پاتا، اور جہاں اس کے خلاف عمل ہوتا ہے وہاں آئے دن مسائل کھڑے ہوتے رہتے ہیں۔

(26) طلبہ کو خارجی اور بیرونی سرگرمیوں اور مصروفیات سے روکا جائے اور کسی بھی اجتماع پروگرام اور خاص طور پر سیاسی پروگرام اور ریلی ومشاعرہ میں طلبہ بغیر ادارے کی اجازت کے قطعاً شریک نہ ہوں۔ (بعض وقت ملکی حالات اور مصلحت اور ملک وملت کے فائدہ کے لئے اس کی اجازت دینی پڑتی ہے)۔

(27) ارباب اہتمام اس بات کا بھی خاص خیال رکھیں کہ جس استاد کو دارالاقامہ کا نگراں متعین کریں اس کے اندر نگرانی کی اہلیت ہو، وہ بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج و ماحول سے واقف ہو، طلبہ کی تربیت کے اصول وآداب سے واقف ہو۔

(28) نگراں حضرات کو چاہئے کہ کبھی کبھی ذمہ دار قسم کے طلبہ کو بلا کر دارالاقامہ اور ہاسٹل کی صفائی ستھرائی کے سلسلے میں اور نظام کو بہتر بنانے کے سلسلے میں صلاح ومشورہ بھی کریں۔

(29) نگراں حضرات کو چاہیے کہ کبھی کبھی طلبہ کے ساتھ ان کے کمرے میں کھانے کا اہتمام کریں یا اجتماعی کھانے کا کوئی نظم کریں اور اپنا کھانا لے کر اس میں شریک ہوں؛ بلکہ انتظامیہ کو چاہئے کہ ایسے موقع پر نگراں حضرات کے لئے کوئی مختصر مد مختص کردیں۔

(30) مدارس کے اساتذہ عام طور پر غریب خاندان یا متوسط خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، گھریلو اور معاشی پریشانی ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، بہت سے اساتذہ کی طبیعت پڑھنے پڑھانے میں اس لئے نہیں لگتی ہے کہ وہ گھریلو حالات میں الجھے رہتے ہیں، ایسے پریشان حال اساتذہ پر انتظامیہ کی نظر رہنی چاہئے اور ان کی معاشی پریشانی اور مسائل کے لئے کوئی تدبیر اور صورت نکالنی چاہئے۔

(31) مدارس کے اساتذہ کو بھی چاہیے کہ اپنے اندر احساس کمتری واحساس کہتری نہ پیدا ہونے دیں۔ اپنے اندر خودی، خودداری اور خوداعتمادی کی دولت پیدا کریں۔ مسائل، مشکلات اور حالات کو جھیلنے، انگیز کرنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، اور اس مصرعہ پر نظر رکھیں...

جس کو ہو جان ودل عزیز، وہ اس گلی میں آئے کیوں

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

# تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

**تسلسل اور محبت و اعتماد کی نشو ونما**: بچہ جیسے جیسے پروان چڑھتا جاتا ہے، والدین کا اپنے بچے سے تعلق اور محبت بڑھتی جاتی ہے، بچہ ابتدائی مہینوں میں والدین پر پوری طرح اعتماد کرتا ہے، پھر وہ والدین اور دوسرے لوگوں کے درمیان تمیز کرنا شروع کر دیتا ہے، بچہ والدین سے حقیقی معنی میں تب متعارف ہوتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بنیادی جسمانی ضروریات کون پوری کرتا ہے، بچہ کے ساتھ اپنے تعامل کے نتیجہ میں والدین کے اندر ایک اچھا احساس پیدا ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کے تئیں بچہ کے اندر بھی خاص احساسات وجذبات جنم لینے لگتے ہیں، پھر بچہ والدین کی طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ اس کی زندگی میں سب سے اہم انسان ہیں۔

اس ابتدائی مرحلہ میں تعلقات کی نوعیت بڑی حد تک والدین کے تعلق کی نوعیت پر مبنی ہوتی ہے، بچہ کی زندگی کا پہلا سال والدین سے مضبوط تعلق پیدا کرنے کے سلسلہ میں بڑا اہم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس مرحلے میں بچہ اسی سے چمٹتا ہے جو اس سے شفقت سے پیش آتا ہے، اس کی بنیادی ضروریات کھانا، پینا وغیرہ پوری کرتا ہے، اس مرحلہ میں جو ربط وتعلق پیدا ہوتا ہے اسی پر آئندہ بچے اور والدین کے درمیان دوطرفہ محبت وتعلق کی بنیاد پڑتی ہے، اس تعلق میں قوت دونوں میں قرب کے بقدر پیدا ہوتی ہے، یہ تعلق اسی قدر مضبوط ہوتا ہے جس قدر والدین بچہ کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، کتنی دیر ان کو گود لیتے ہیں، ان کے ساتھ کھیل کود کرتے ہیں، ان کو کھلاتے پلاتے ہیں، ان کی صفائی ستھرائی پر توجہ دیتے ہیں، ان کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، ان کی تکلیف وپریشانی میں ان کو مطمئن کرتے ہیں۔

چنانچہ اگر عمر کے پہلے سال میں بچہ، اور والدین کے درمیان یہ ربط وتعلق مضبوط بنیادوں پر پروان نہیں چڑھتا، مثلاً اگر بچہ کو بہت سے لوگوں کی رعایت اور توجہات کے سہارے چھوڑ دیا جائے، جیسے کہ ہم یتیم خانوں میں دیکھتے ہیں، یا اس کو اس طرح تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ طویل وقت تک کوئی اس سے ملتا جلتا نہیں، تو بچہ کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں شفقت اور نشو ونما کے اس نقصان اور محرومی کی بھرپائی کر سکے۔

**اعتماد کی ترقی** (Confidence buildup): بچے سے اس ربط وہم آہنگی کے نتیجے میں بچہ کے اندر والدین پر اعتماد کا احساس پیدا ہوتا ہے، جو انتہائی اہم ہے، یہی وہ بنیادی شعور ہے جس کو بچہ عمر کے پہلے سال میں حاصل کرتا ہے، یہ شعور اس کو آئندہ زندگی میں اپنی شخصیت کی تعمیر کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، اس ٹھوس زمین اور مضبوط بنیاد کے سبب پھر اس کے لئے اپنے گردوپیش کی دنیا کو سمجھنا آسان ہوتا ہے، اس ربط واعتماد کے سبب وہ دوسرے

لوگوں پر بھی اعتماد کرنا سیکھ جاتا ہے، وہ اپنے گھر کو ''خوشیوں سے پر اور محفوظ گھر'' تصور کرتا ہے، جہاں اس کو رعایتیں ملتی ہیں، محبتیں دی جاتی ہیں، اس کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ سیکھتا ہے کہ انسان اچھے ہوتے ہیں، انسان انسانوں کی مدد کرتے ہیں، ان کو محبتیں دیتے ہیں، ان کو محفوظ رکھتے ہیں اور ان کی خوشی کا سامان کرتے ہیں، اس طرح جب اس کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان پر اعتماد کرتا ہے، اور والدین کے درمیان اس اعتماد کے سبب بچہ ایک ایسا سماجی انسان بنتا ہے جو دوسروں کو قبول کرتا ہے، ان کا استقبال کرتا ہے، اگر ایسا بچہ شرمیلے مزاج کا ہو تو بھی وہ بالعموم لوگوں کو اچھا سمجھتا ہے اور رفتہ رفتہ لوگوں کے ساتھ تعامل (Interaction) میں اس کا تردد ختم ہو جاتا ہے۔

بچہ میں اعتماد کا احساس جگانے میں ایک چیز بہت اہم ہے، لوگ محبت وشفقت وغیرہ پر تو توجہ دیتے ہیں مگر ایک پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور وہ ہے تسلسل، تسلسل سے مراد یہ ہے کہ والدین بچہ کے ساتھ ہمیشہ ایک ہی معیار کو روا رکھیں اور اس کے سامنے واضح اور یکساں موقف کا اظہار کریں، مثلاً اگر بچہ کے لئے کوئی چیز نقصان دہ ہے جس سے اس کا بچنا لازم ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کے لئے نقصان دہ ہونا چاہیے اور ہمہ وقت اس کو بچنا لازم ہے، اسی طرح بچہ کو اگر کوئی کام کرنا ہی ہے، مثلاً اس کو اسکول جانا ہے تو بس جانا ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے اسکول جانے کا عمل والدین کے مزاج اور حالات کے تابع ہو اور والدین کا موقف بدلتا رہے، اس تسلسل کی بنیاد پر بہت جلدی بچہ یہ سمجھ جائے گا کہ جس بنیاد پر وہ اپنے والدین کے ساتھ تعامل کرتا ہے وہ بنیاد ٹھوس ہے، اس کے سبب اس کو زندگی کے لئے ایک نمونہ میسر آئے گا، ایک واضح اور ثابت نظام ملے گا جس سے وہ مانوس ہوگا اور اس کے ساتھ جینے میں راحت محسوس کرے گا، اس پر اس کو اعتماد و اطمینان ہوگا۔ یہ نمونہ اس کو اپنے گرد وپیش کی دنیا کو سمجھنے میں معاون ہوگا، اس کے لیے دنیا میں پیش آنے والے واقعات کے اسباب ونتائج کو سمجھنے میں بھی مددگار ہوگا اور اس طرح اس کو بھری پری دنیا میں خود اپنے کردار کا بھی شعور ہوگا۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ بچہ چاہے جس مزاج کا ہو مگر ایک اچھے نظام اور صاف ستھرے روٹین کے سبب زیادہ بہتر طریقہ پر پروان چڑھتا ہے اور بڑا ہوتا ہے، یہ بات از خود تسلسل اور تعامل میں استقامت کی ضرورت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

جب بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو وہ کچھ نہیں جانتا ہے، کچھ نہیں سمجھتا ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے: واللہ أخرجکم من بطون امھٰتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والأفئدۃ..... (النمل:۷۸)

(ترجمہ: اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے.....)

چنانچہ اس بچہ کے سامنے حقائق کے ادراک، معلومات حاصل کرنے اور نئی نئی چیزوں سے واقف ہونے کا وسیع میدان اور مسلسل سفر ہوتا ہے، اگر نظام موجود ہو تو پورے اعتماد اور آسانی کے ساتھ وہ زندگی کی گہرائیوں اور وسعتوں میں داخل ہوتا ہے، یہ بات خود بڑوں پر بھی صادق آتی ہے، کہ اگر ہمارے گرد وپیش کی دنیا مرتب ہو، ہر کام کو کرنے کا وقت، ڈھنگ اور انداز متعین ہو تو بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو، ہر کام بے ربط و بے ترتیب ہو، کوئی متعین نظام نہ ہو، طریقے روز بدلتے رہیں تو ہم ذہنی انتشار کا شکار ہو جائیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے بچہ کو گرد وپیش کی دنیا کو اس طرح دیکھنے میں مدد کریں کہ وہ سمجھنے

کے قابل ہے، برتنے اور احاطہ کرنے کے لائق ہے، یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ اس کے ساتھ ایک روٹین کے تحت معاملہ کریں، اس کی روزمرہ کی زندگی کے لئے ایک واضح اور مرتب نظام متعین کریں، ایسا نہ ہو کہ ہر کام وقتی ہو، نہ کوئی ترتیب ہو نہ کوئی نظام، تسلسل کی کتنی اہمیت ہے اور بچے ہر چھوٹی بڑی تبدیلی کو کتنی شدت سے محسوس کرتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ تمام والدین کے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ بچہ جب بولنا سیکھتا ہے تو وہ ہر نئی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے، ہر تبدیلی اور غیر مانوس چیز کے متعلق پوچھتا ہے، مثلاً وہ یہی پوچھ لیتا ہے، ''ابا آج آپ دیر سے کیوں آئے''، ''آج کھانا اس کمرے میں کیوں نہیں کھایا جا رہا ہے جس میں روز کھایا جاتا ہے۔''

یہ درست ہے کہ تغیر و تبدیلی زندگی کا ایک فطری حصہ ہے، جس کے مطابق ہر بچہ اور ہر بڑے کو اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیے، کیوں کہ لوگ اپنی زندگی کے تمام معاملات کو آلات اور گھڑی کی طرح ایک ترتیب کے پابند نہیں بنا سکتے، لیکن اس میں کوئی تردد نہیں کہ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کچھ ترتیب اور کچھ نظم وضبط قائم رکھیں، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ اکثر معاملات کو ترتیب و نظام کا پابند بنایا جائے اور متعلقہ افراد کو اس متعین نظام کے اسباب سے کسی قدر واقف کرا دیا جائے۔

جو بچہ اپنے والدین پر اور زندگی میں ان کے تعامل وتصرفات پر اعتماد کرتے ہوئے پروان چڑھتا ہے، تو اس کا مزاج جو بھی ہو مگر اس کو بہتر طریقہ پر یہ موقع ملتا ہے کہ پورے اعتماد و اطمینان اور خیر کی امید کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنا شروع کرے، وہ اپنے مزاج، اپنے اعصاب اور اپنے ردعمل کے ساتھ جینے پر زیادہ قادر ہوتا ہے، اس اعتماد کے سبب وہ اس پر بھی قادر ہوتا ہے کہ وہ بے چینی اور پریشانی کے حقیقی اسباب اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں اور کمزور اسباب کے درمیان فرق کر سکے جو ناسمجھی سے کبھی کبھی پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔

خود ہم بڑوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم کو گھریلو زندگی میں استقرار و اطمینان حاصل رہے تو ہم زندگی کو برتنے پر زیادہ قادر ہوتے ہیں، اسی طرح اگر ہم کسی پیشے سے وابستہ ہیں یا کسی جگہ کام کرتے ہیں تو اگر ہمیں یہ اعتماد ہے کہ یہ کام مستقل ہوگا، نہ صاحب عمل ہمیں ہٹائے گا اور نہ ہی اچانک اپنا طریقۂ کار تبدیل کرے گا، تو ہم اس کام کو زیادہ اچھے طریقے پر کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جب بڑوں کی قوت عمل پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ذرا بچوں کے متعلق سوچیے کہ وہ جس دنیا اور جس ماحول میں رہتے ہیں، اس میں ان کے پاس والدین کے سلوک و معاملات کے علاوہ اس دنیا اور ماحول کو سمجھنے کا کوئی دسرا بنیادی مصدر نہیں ہوتا، عالم عربی اور عالم اسلامی میں پائے جانے والے اضطراب و بے کاری کا اصل سبب گھروں کے اندر پائی جانے والی بے اصولی اور بے کاری ہے۔

بچپن کی پوری مدت میں بچہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا یقین رہے کہ یہ رعایت و توجہ اور وافر محبت اس کو اپنے والدین سے ہمیشہ ملے گی، وہ اس کو اس سے ہرگز کبھی بھی محروم نہ کریں گے، اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بغیر کسی بے اصولی اور اضطراب کے ایک سمجھے ہوئے پہچانے ہوئے اصول و نظام کے ساتھ تعامل کر رہا ہے، اس کے ساتھ لوگوں کے معاملات و تصرفات مسلسل اور دائمی ہیں۔ یہ تمام چیزیں بچے کے لیے معاون ہوتی ہیں، کیوں کہ ان کی مدد سے دنیا، زندگی، خود اپنی ذات اور والدین کی ایک صاف تصویر اس کے سامنے آتی ہے، اور انھیں عناصر کی مدد سے وہ اپنی زندگی میں اپنی قیمت کو سمجھ پاتا ہے اور اپنے مقام و مرتبہ سے واقف ہو پاتا ہے۔

☆☆☆

❑ فتنۂ انکار حدیث

# جدید منکرین حدیث

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

نوٹ: راقم نے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم کی مشہور کتاب ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' کی اردو تلخیص وترجمانی کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا ایک بڑا حصہ شائع بھی ہو چکا ہے، پھر یہ سلسلہ بعض اسباب کی بنا پر موقوف ہو گیا۔ اب پھر سے اس کی تجدید کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے تکمیل تک پہنچائے۔ آمین۔ (ف۔ح۔ن)

ہمارے اس زمانہ میں بعض ایسے لوگ ہیں، جنہیں فن حدیث سے کوئی واقفیت نہیں، پھر بھی اس پر خامہ فرسائی کی کوشش کرتے ہیں، انہی میں ایک نام ڈاکٹر توفیق صدقی کا ہے، سید رشید رضا مرحوم کے مجلّہ ''منار'' کے سال نہم کے ۷ ویں اور ۱۲ ویں شمارے میں موصوف کے دو مقالے شائع ہوئے، جن کا عنوان تھا ''اسلام صرف قرآن میں ہے'' مقالہ نگار نے اپنے دونوں مقالوں میں کھل کر اس فکر کا اعلان کیا کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے بس قرآن کافی ہے، اس کے لئے احادیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ موصوف نے اپنے اس نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے کچھ دلائل بھی پیش کیے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ما فرطنا فی الکتاب من شیء، اور دوسری جگہ ارشاد ہے ونزلنا علیك الکتاب تبیاناً لکل شیء، ان سے پتہ چلا کہ قرآن میں دین سے متعلق ہر چیز موجود ہے، اب حدیث جیسی کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں، ورنہ قرآن میں تفریط (کمی) کا ہونا لازم آئے گا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''انا نحن الذکر وانا له لحافظون'' سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اگر حدیث بھی حجت و دلیل ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیتا۔

۳۔ اگر حدیث حجت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اسے لکھنے کا ضرور حکم دیتے، اور آپ کے صحابہ وتابعین اس کی جمع وتدوین پر توجہ دیتے، کیوں کہ اسی سے قطعی الثبوت طریقہ سے وہ مسلمانوں تک پہنچ سکتی تھی، ورنہ ظنی الثبوت سے تو احتجاج کرنا ہی صحیح نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''ولا تقف ما لیس لك به علم'' اور ''ان تتبعون الا الظن'' حدیث اسی صورت میں قطعی الثبوت ہو سکتی تھی جب قرآن کی طرح اسے بھی قید تحریر میں لایا جاتا۔

اس کے برخلاف پتہ یہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرمایا، اور لکھی ہوئی حدیثوں کو مٹانے کا حکم صادر فرمایا، اور یہی کام صحابہ اور تابعین نے کیا، چنانچہ حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا تھا، پھر اسے جلا دیا اور فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نے کسی ایسے شخص پر بھروسہ کر کے جو درحقیقت قابل اعتماد نہ ہو، اس کی بیان کردہ حدیث کو اس میں درج کر دیا ہو، اسی طرح حضرت زید بن ثابت سے حضرت معاویہ نے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا، جب انہوں نے بتا دیا تو حضرت معاویہ نے اسے لکھنے کا حکم دیا، مگر حضرت زید نے اسے مٹانے کا حکم صادر فرمایا۔

حضرت عمر نے بھی حدیثیں لکھنے کا عزم کیا، مگر پھر یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے ہاتھ سے کچھ کتابیں مرتب کیں اور ان پر اس طرح جٹ پڑے کہ کتاب الٰہی کو فراموش کر بیٹھے، خدا کی قسم! میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط نہیں ہونے دوں گا۔

حضرت علی نے بھی کچھ لوگوں کو جنہوں نے بعض احادیث لکھی

تھی، انہیں مٹانے کا حکم دیا، اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ نے بھی ایک صحیفہ مٹادیا جو ان کی روایات پر مشتمل تھا۔

تابعین میں سے علقمہ، عبیدہ، قاسم بن محمد، شعبی، نخعی، منصور اور اعمش کتابت حدیث کو ناپسند کرتے تھے؛ بلکہ بعض حضرات سے تو حدیث لکھنے کی ممانعت یا تقلیل روایت کی بات منقول ہے۔ اس طرح احادیث بہت بعد میں چل کر مدون کی گئیں، جب ان میں عام طور سے خطاونسیان کی آمیزش ہوچکی تھی، اس لئے اب وہ قابل اعتبار نہ رہیں۔

۴۔ خود آپ ﷺ سے ایسے اقوال منقول ہیں جو حدیث کے حجت نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں، جیسے آپ نے فرمایا: حدیثیں مجھ سے بہت پھیلیں گی، لہذا جو قرآن کے موافق ہو اسے میری حدیث سمجھنا اور جو قرآن کے مخالف ہو وہ میری حدیث نہیں ہے۔

بنا بریں جس حدیث سے کوئی نیا حکم شرعی ثابت ہوگا وہ قرآن کے موافق نہ ہوگی۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جسے تم پہچانتے ہو تو اس کی تصدیق کرو، خواہ میں نے اسے کہا ہو یا نہ کہا ہو، اس لئے کہ میں وہی بات کہتا ہوں جو جانی پہچانی ہوتی ہے، انوکھی اور نرالی نہیں ہوتی، اور جب تم سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جسے تم پہچانتے نہ ہو، تو اس کی تصدیق نہ کرو، اس لئے کہ میں ایسی بات نہیں کہتا جو انوکھی ہو اور جانی پہچانی نہ ہو۔

اس سے پتہ چلا کہ آپ ﷺ کی طرف منسوب حدیث کو قرآن کے معروف احکام پر جانچنا ضروری ہے، لہذا حدیث فی ذاتہ حجت نہ ہوئی۔ اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: میں اسی چیز کو حلال ٹھہراتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور اسی کو حرام قرار دیتا ہوں جسے اس نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے۔

یہ ہے ڈاکٹر صدقی کے حدیث نبوی کے خلاف وارد کردہ شکوک وشبہات کا خلاصہ جن کی حیثیت تار عنکبوت سے بھی زیادہ نہیں، ہم نیچے ان کے جوابات عرض کرتے ہیں۔

**پہلے شبہ کا جواب:** قرآن میں ہر دینی حکم کے موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دین کے عام اصول و قواعد کا بیان ہے، فروعیات و جزئیات اس سے مراد نہیں۔ اس لئے کہ ایک عامی کو بھی معلوم ہے کہ اس میں بہت سے احکام صراحۃ مذکور نہیں ہیں اور بعض احکام مجملاً بیان کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل وتشریح کی ذمہ داری رسول پاک علیہ السلام کو سونپی گئی، اور چونکہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے اس لئے آپ کی تشریح وتوضیح قرآن ہی کے حکم میں ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرعی احکام خواہ کتاب وسنت سے ثابت ہوں یا اجماع وقیاس سے وہ صراحۃ یا دلالۃ قرآن ہی کے احکام ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں: اللہ کے دین کے سلسلہ میں کسی کو جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے کتاب خداوندی میں اس کی رہنمائی موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما أنزل إليهم اور ''بیان'' کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے قرآن کی جو تشریح وتوضیح کی: اس کی چند قسمیں ہیں اور سب اس لفظ میں داخل ہیں:

۱۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور فواحش ومنکرات شراب، خون اور خنزیر وغیرہ کی حرمت قرآن میں بیان کی گئی، آپ نے ان کی تفصیل وتشریح فرمائی۔

۲۔ بعض فرائض کی نوعیت وکیفیت جیسے نماز اور اس کی رکعات کی تعداد اور زکوۃ کے نصاب وغیرہ کی توضیح۔

۳۔ قرآن سے الگ کچھ سنتیں مقرر کیں، اور چونکہ قرآن میں آپ کی اطاعت کو فرض بتایا گیا ہے، اس لئے آپ کی ان سنتوں کو قبول کرنا دراصل خدا کے حکم کو ہی قبول کرنا ہوگا۔

۴۔ بعض مسائل کی طلب وتلاش میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اجتہاد کو فرض قرار دیا، اور دیگر احکام شرعیہ کی طرح اجتہادی احکام

میں بھی ان کی اطاعت کو آزمایا۔

لہذا جو بھی ان میں سے کسی سنت کو قبول کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کے حکم کو قبول کرنے والا ہے۔

**دوسرے شبہ کا جواب**: "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" میں ذکر سے مراد صرف قرآن نہیں بلکہ اس سے مراد شریعت ہے، جو قرآن اور سنت دونوں کی جامع ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی، اسی طرح سنت کی بھی حفاظت کی کہ اس کے لئے ایسے ایسے ائمہ پیدا فرمائے جنہوں نے اس کی حفاظت میں اپنی جانیں کھپا کر ایک ایک حدیث کو محفوظ فرمادیا۔

علماء نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے اور ان میں سرِ فہرست امام شافعی ہیں کہ تمام حدیثیں عام اہل علم کے پاس موجود ہیں، یعنی ایسی کوئی حدیث نہیں جو ان میں سے ایک کے پاس بھی نہ ہو۔ لہذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی حدیثوں میں سے ایک بھی حدیث ضائع نہ ہوئی۔

ابن حزم فرماتے ہیں: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انا نحن نزلنا الذکر سے مراد صرف قرآن ہے، ان کا دعوی جھوٹا اور دلیل و برہان سے عاری ہے۔ ذکر سے مراد وہ چیز ہے جو آپ پر نازل ہوئی، قرآن ہو یا حدیث۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن میں بہت سے احکام مجمل ہیں، اب اگر احادیث کو غیر محفوظ قرار دے دیا جائے تو نصوص قرآن سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

**تیسرے شبہ کا جواب**: آپ ﷺ کا احادیث کی کتابت سے منع فرمانا جیسا کہ بعض صحیح احادیث میں ہے، اس کے حجت نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ آپ نے اس وقت مصلحت سے منع فرمایا، وہ مصلحت یہ تھی کہ آپ نے بالکل ابتداء میں صحابہ کرام کو کتابت قرآن میں لگا دیا، تاکہ اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہوجائے، بعد میں جب یہ ضرورت نہ رہی، تو آپ نے کتابت حدیث کی اجازت دے دی۔

اور یہ ابتدائی دور کی ممانعت بھی سرکاری طور لکھنے کی تھی، ورنہ انفرادی طور بہت سے صحابہ اس وقت بھی لکھا کرتے تھے۔

اور ایک بات یہ بھی کہ حدیث کا حجت ہونا اس کی کتابت ہی پر موقوف نہیں، اس لئے کہ حجت کئی طریقوں سے ثابت ہو جاتی ہے، مثلاً حدیث کا متواتر ہونا، عدول اور ثقہ راویوں سے منقول ہونا، انہی میں ایک طریقہ کتابت کا بھی ہے۔ خود قرآن کی بابت بھی صحابہ نے صرف لکھنے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سینہ میں محفوظ کیا۔

لہذا کسی چیز کو حفظ کرنا صحت وضبط کے لحاظ سے کسی طرح بھی کتابت سے کم نہیں، خاص کر عرب قوم جس کا حافظہ ضرب المثل تھا، پورا قصیدہ صرف ایک دفعہ سن کر من وعن یاد کرلیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے عمر بن ربیعہ کا قصیدہ ایک ہی نشست میں یاد کرلیا تھا۔ اور زہری نے عبدالملک کا خط جو کہ لوگوں کو مسجد کے منبر سے سنایا گیا تھا، حضرت سعید بن مسیّب کو جوں کا توں سنا دیا تھا۔ یہ حضرات کتابت سے زیادہ حفظ پر بھروسہ کرتے تھے، اسی لئے بہت سے لوگ جن کے نام موصوف (منکر حدیث) نے درج کئے ہیں، کتابت کو معیوب سمجھتے تھے تاکہ قوت حافظہ کمزور نہ پڑ جائے اور وہ کتابوں کا سہارا نہ لینے لگیں۔

اس کے ساتھ ساتھ صحابہ و تابعین کے ورع وتقوی کو بھی سامنے رکھا جائے، کہ وہ ذرا سے وہم کی وجہ سے تحریر کردہ احادیث کو مٹا دیا کرتے تھے، جیسا کہ موصوف نے حضرت صدیق کا واقعہ نقل کیا ہے، اگر وہ صحیح ہو، ورنہ تو بقول امام ذہبی یہ واقعہ غلط ہے۔

اور جہاں تک بعض صحابہ کے روایت حدیث سے احتراز کی بات ہے تو اس کی وجہ صرف احتیاط فی الدین کی شدت تھی، جیسا کہ حضرت زبیرؓ نے خود اس کی صراحت فرمائی تھی، یعنی اس بات کا خوف کہ کہیں غلطی سے آپ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب نہ ہوجائے، ورنہ تو صحابہ و تابعین کا حدیث کی کتابت کرنا - چہ جائیکہ روایت - تواتر

معنوی سے ثابت ہے۔

اور رہی یہ بات کہ حدیث کی تدوین بہت بعد میں ہوئی، جس کی وجہ سے اس میں شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہیں اور وہ ظنی ہو گئیں، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو تحریف ووضع کے مقابلہ میں علماء کی کوششوں سے ناواقف ہو۔

صحابہ کے زمانہ سے ہی حدیث کی روایت زیادہ تر زبانی اور گاہے تحریری ہوتی تھی، اور یہ سلسلہ درسلسلہ روایت ہوتی رہیں، سند کی کڑی اگلی کڑی سے ملتی رہی، چنانچہ جس وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے امام زہری کو ان کی تدوین کا حکم فرمایا، وقت تک میں ایک لمحہ کے لئے بھی احادیث کی روایت میں انقطاع نہیں ہوا، لہذا ایسی صورت میں شک کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

اور حدیث میں جو بعض لوگوں کی طرف سے کذب ودروغ گوئی کا سہارا لیا گیا تو علماء نے اس کی ایسی قلعی کھولی کہ اس میں شک کا احتمال ہی نہیں رہا، بلکہ یقین کی حد تک نفس کو ان پر اطمینان ہوتا ہے۔اور پھر ہم خبر آحاد سے علم یقین کے حاصل ہونے کا بھی دعوی نہیں کرتے، بلکہ یہ مانتے ہیں کہ ان سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اور اس بات سے کوئی اندھا بھی انکار نہیں کرسکتا، اور یہی بات دلیل کے لئے کافی ہے۔

اور رہا یہ دعوی کہ دینی احکام میں ظن پر عمل کرنا جائز نہیں، تو اس کا تعلق اصول وضروریات دین سے ہے، جن کا منکر کافر ہوجاتا ہے، ورنہ تو دینی احکام کا زیادہ تر دارومدار ظن پر ہی ہے، خود یہ مخالف بھی اس بات کا دعوی نہیں کرسکتا کہ دین کے تمام احکام قطعیات سے ثابت کئے جاتے ہیں۔

بلکہ حال تو یہ ہے کہ قرآن سے جو قطعی احکام ماخوذ ہیں، ان کی تعداد ان اجتہادی احکام سے بہت کم ہے جو نصوص قرآن سے مستفاد کئے گئے ہیں۔

اور جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا کہ جب گواہی میں ایک شخص پر بھروسہ کرلیا جاتا ہے، جس سے کذب وخطا کا صدور ممکن ہے تو پھر یہاں ظنی حدیث سے احکام کا اثبات کیوں نہیں کیا جاسکتا۔

## چوتھے شبہ کا جواب:

منکر حدیث نے اس سلسلہ میں جو احادیث پیش کی تھیں، وہ یا تو ثابت نہیں، یا ان کا مفہوم غلط بیان کیا گیا ہے۔پہلی حدیث: بیہقی اور شافعی نے اسے منقطع قرار دیا ہے، ابن حزم نے اس حدیث کے ایک راوی، حسین بن عبداللہ، کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ساقط الاعتبار اور متہم بالزندقہ ہے۔اور بیہقی نے فرمایا ہے کہ ''حدیث کو قرآن پر پیش کرنے والی روایت، باطل ہے۔'' یہاں ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ اگر مذکورہ حدیث کو اہل علم نے سند کی وجہ سے مردود قرار دیا ہے، تب تو تسلیم۔ورنہ اگر اس کے متن کی وجہ سے اسے رد کیا گیا ہے تو یہ روایت مختلف الفاظ میں مروی ہے، اس لئے کہ اکثر روایتوں میں ہے کہ: جو موافق ہو اسے قبول کرلو اور جو مخالف ہو یا موافق نہ ہو اسے رد کردو۔اور یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر اسے ضعیف قرار دے دیا جائے۔

اس لئے کہ خود علماء نے موضوع حدیث کی پہچان یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، یہی بات اور مذکورہ حدیث میں کہی گئی ہے۔

ہاں اگر اس میں یہ الفاظ ہوتے کہ ''جو کچھ تم خدا کی کتاب میں پاؤ اسے قبول کرلو اور جو نہ پاؤ اسے رد کردو'' تو یہ حدیث باطل ٹھہرتی، کیوں کہ بہت سی صحیح اور مقبول احادیث ایسی ہیں جن سے ایسے احکام بھی ثابت ہوتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ اگر یہ روایت ضعف سند کی وجہ سے رد کی گئی ہے، تب تو ٹھیک، ورنہ اس کا متن مختلف طریقوں سے ثابت ہے، البتہ موصوف نے اسے جو معنی پہنانے کی کوشش کی ہے، وہ غلط ہے، اس کا صحیح مفہوم وہ ہے جو ہم نے اوپر ذکر کیا۔

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۱۷)

# مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

**سیاسی بصیرت:**

باوجود اس کے کہ ملائم سنگھ نے ۱۹۹۰ء میں بابری مسجد کے لئے اچھے اقدامات کئے لیکن جب وہ نومبر ۱۹۹۰ء میں دوبارہ وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو مولانا نے صراحت کے ساتھ یہ بات صاف کردی اور بہت سچی بات کہی اس لئے کہ اگر سیاست میں برابری کی سطح پر بات کرنے کی پوزیشن نہ ہو تو پھر ماضی کے بہت اچھے تجربات کی بنا پر بھی یقین کامل نہیں ہونا چاہئے، یہ اقتباس حضرت کا اس وقت تو اور رہنما ہو جاتا ہے جبکہ اسی حکومت سے مسلمانوں کو تلخ تجربے ہو رہے ہیں:۔

''مسلمان عام طور پر ان کے انتخاب سے خوش ہوئے، اس سے بھی بحث نہیں کہ یہ خوشی کب تک برقرار رہے گی، اور وہ اپنے گذشتہ طرز عمل کو کہاں تک نباہ سکیں گے اور اس کو حق بجانب بھی سمجھیں گے کہ سیاست شطرنج کی ایک ایسی بازی ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت پیادہ کو بڑھایا جائے گا اور کس وقت سوار کو'' (کاروان زندگی ج۴ص۳۷۳)

**فسادات کیوں پیش آتے ہیں:**

۱۲؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں حکومت کے زیر سرپرستی ہندو اور مسلمان کا ایک مشترکہ جلسہ ہونے والا تھا، مولانا نے اس میں اپنا ایک مضمون بھیجا، اس میں تحریر فرمایا کہ فسادات کی بنیاد چار وجوہات ہیں:

۱۔ فرقہ ورانہ منافرت۔ ۲۔ظلم وسفاکی۔ ۳۔ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں، اس کے مقابلہ میں صف آرا (Confront) ہوجانے والوں، اور اس کے روکنے کے لئے ہر طرح کا خطرہ مول لینے والوں کی کمی، خاص طور پر اس موقع پر مذہبی پیشواؤں کا میدان میں نہ آنا اور حالات سے مقابلہ نہ کرنا، ۴۔حکومت اور اقتدار کو ہر ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنے اور اس کے لئے ہر اصول و معیار اور صداقت و انصاف کو قربان کردینے کا مزاج، پھر انتخاب (Elections) کا وہ طریقہ جس میں ہر اصول اور اخلاق کو پس پشت ڈال کر اور ملک کے مفاد کو نظر انداز کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حمایت و تائید (Support) حاصل ہو سکے''۔ (کاروان زندگی ج۵ص۱۴)

مولانا نے اس موقع پر ''خاص طور پر'' مذہبی پیشواؤں کا تذکرہ کیا ہے چہ جائیکہ کہ آج کے عہد میں کچھ لوگ بالکل خاموش ہیں تو کچھ لوگ سطحی مفادات کے حصول میں ایسے مواقع پر پیش پیش ہوتے ہیں، مخلصانہ کوششیں ہوتی ہی نہیں اور اگر کوئی یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھائے تو مذکورہ دونوں طبقہ کے لوگ اس کے درپہ ہوجاتے ہیں اور تعاونو علی البر کے بجائے اس کے پیچھے پڑجانے کی پالیسی اختیار کر لیتے ہیں۔

**بنیاد پرستی کا پروپیگنڈہ :**

خاص طور پر امریکہ اور پورے یورپ نے جس طرح سے اسلام پر عمل کرنے والوں اور اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف ایک پروپیگنڈہ مہم چلائی اس سے مسلم معاشرہ بے حد متاثر ہوا، حتی کہ بعض لوگ تو اس قدر مرعوب ہوئے کہ بنیاد پرست کہے جانے کے ڈر سے شعائر اسلام تک چھوڑ دینے پر آمادہ ہوگئے، مولانا نے اس پر شدید تفکر کا اظہار کیا اور کاروان زندگی کی پانچویں جلد میں لکھا کہ ''اس پر عزم وعجلت کے ساتھ قابو پانے کی ضرورت ہے (ص ۲۰۷) لیکن افسوس ہے کہ یہ مرض بڑھتا گیا اور اب تو اچھے اچھے لوگ بھی اس کے مقابلہ میں دفاعی پوزیشن اختیار کر کے بیٹھ گئے اور اسلام کو محدود تصور کر لیا اور بعض موقعوں پر بعض چیزوں پر عمل کرنے پر اکتفا کیا، یہ چشم کشا تحریر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

''اسلامی ذہن واعتقاد، فکر ونظر اور مسلم معاشرہ و ماحول کو تاریخ کے مختلف وقفوں میں بہت سی انتشار انگیز اور گمراہ کن یا تشکیکی تحریکوں اور دعوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں اعتزال اور خلق قرآن کا عقیدہ، فلسفۂ یونان سے حد سے بڑھی ہوئی مرعوبیت، اور اس کے مطابق دین کے حقائق وعقائد کی تاویل وتشریح، پھر دور آخر میں مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت، اس کے سامنے سپر اندازی، اور اس کے مطابق دین کی اور بعض اوقات قرآن کی تفسیر وتاویل، پھر آخر میں الحاد ولادینیت کا رجحان جو جدید تعلیم اور مغربی اقتدار کے اثر سے بہت سے مسلم ممالک اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں پیدا ہوا۔

لیکن ان میں سے کوئی چیز (اپنی وقتی اور مقامی سحر انگیزی اور دل کشی کے باوجود) اسلام کے وجود وبقا کے لئے خطرہ اور اس کو زندگی سے خارج کرنے اور ہر طرح کے اثر اور کامیابی سے محروم کرنے کے لئے ایک گہری سازش اور پھر پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت نہیں رکھتی تھی جتنی امریکہ سے اٹھنے والی بنیاد پرستی اور بنیاد پرستوں (Fundamentalists) کے خلاف نعرہ جدو جہد اور ایک منصوبہ بند عالمگیر تحریک و دعوت ہے، جس میں یہودی دماغ، امریکہ اور یورپ کا دینی وعلمی، وفکری، دعوتی سطح پر احساس کہتری (Inferiority Complex) اسلام کے دائرہ کی وسعت اور خود مغرب میں اس کی اشاعت ومقبولیت کا خطرہ اور آخر میں روس کے انقلاب کے بعد اسلام اور ایک طاقتور اسلامی دنیا کا (جس میں اسلام کے احیاء اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے، اور اس میں دنیا کے سامنے ایک سحر انگیز نمونہ پیش کرنے کی صلاحیت ہے) مادہ پرست مغرب کے خلاف ایک طاقتور محاذ بن جانے کا خطرہ شامل ہے، اس کا اصل محرک ہے، یہ تحریک جو نشر واشاعت کے ذرائع، ترغیب وترہیب، سیاسی وفوجی رشوتوں، وفود کی آمد و رفت، بین الاقوامی مجلسوں اور سب سے بڑھ کر خود اسلامی ملکوں کو اس طبقہ سے خوفزدہ کرنے کے ذریعہ جو ان اسلامی ملکوں میں اسلام کو زندگی میں داخل کرنے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہے، پہونچائی اور پھیلائی جارہی ہے، اور خود مسلم وعرب ممالک میں صاحبِ اقتدار طبقہ، اور نظام تعلیم اور صحافت واشاعت کے ذرائع پر قابو رکھنے والے طبقہ میں یہ ہراس پیدا کیا جارہا ہے، کہ اگر یہ اسلام پسند طبقہ (جس کے لئے ''بنیاد پرست'' کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے) کامیاب اور حاوی ہوگیا، تو یہ حکومتوں اور رہنما اداروں کے لئے پیغامِ موت ہوگا، ان کو ہر طرح کے اقتدار اور نفوذ واثر

سے محرورم ہونا پڑے گا، بلکہ ان کو ان ملکوں میں زندگی گذارنی بھی مشکل ہو جائیگی، جہاں وہ سیاہ سپید کے مالک اور مطلق العنان حاکم ہیں۔

یہ خیال مسلم وعرب ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور مقبولیت حاصل کر رہا ہے، بعض ملکوں میں (جن میں افریقہ کے متعدد عرب ممالک الجزائر تیونس، لیبیا پیش پیش ہیں، اور مصر نے بھی اب اس دائرہ میں قدم رکھ دیا ہے) اب ساری توجہ اور جدوجہد اسی طبقہ اور جماعت کو بے اثر بنا دینے، بلکہ ان کے خطرہ سے مستقل طور پر مامون ومحفوظ ہو جانے پر مرکوز ہوگئی ہے، جو دین کا علانیہ نام لیتا ہے، معاشرہ کو دینی تعلیمات اور اسلام کی معاشرتی واخلاقی اور شرعی تعلیمات کا عامل وحامل اور اس کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہے، کہیں اس طبقہ کے لئے ''متشددین'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کہیں ''متزمتین''، کہیں ''رجعیین'' کا، کہیں ''مبدئین'' کا، کہیں ''اصولیین'' کا، ان کے خلاف بڑے بڑے ذمہ دارانِ حکومت تقریریں کرتے ہیں، ان کے متعلق عالمِ اسلامی کے علماء سے استفسار اور استفتاء کیا جاتا ہے، حکومت کے ترجمان یا ہم خیال اخبارات ورسائل میں مضامین نکلتے ہیں، کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے ہیں، اور اب ڈر یہ ہے کہ شاعر کا یہ مصرعہ ؎

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

حقیقت نہ بن جائے، بلکہ اس سے بڑھ کر مرغ قبلہ نما کی زبان سے یہی الفاظ نہ نکلنے لگیں، جو یہ ترقی پسند ممالک اور امریکہ کے غاشیہ بردار بے محابا اپنی زبان سے نکالتے ہیں، اس وقت یہودیوں اور مسیحیوں کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے جو عالمِ اسلام کے لئے صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے، علمی وفکری، بلاغی (اشاعتی) وسیاسی وتنظیمی، ملکی وبین الاقوامی، ہر سطح پر مؤثر جدوجہد کی ضرورت ہے کہ جب اسلام کو زندگی سے خارج کر دیا جائیگا، اور اصول ومبادی، خطوط وحدود، سب مٹا دیئے جائیں گے، تو پھر وہ دین کہاں باقی رہ جائیگا، جو کفر وایمان، توحید وشرک، یہاں تک کہ سنت و بدعت، طاعت ومعصیت، صلاح وفسق، صدق وکذب اور حلال وحرام میں فرق کرتا ہے، اور جو صاف کہتا ہے ''قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللّٰہ فقد استمسك بالعروة الوثقی'' (سورۃ البقرہ: ۲۵۶) (ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے، تو جو کوئی طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) اور اس کا مطالبہ ہے ''یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدوّ مبین'' (سورۃ البقرہ: ۲۰۸) (اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے) اور جس کا صاف اعلان ہے ''ان الدین عند اللّٰہ الاسلام'' (سورۃ آل عمران: ۱۹) (یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) (کاروان زندگی ج ۵ ص ۲۰۷ تا ۲۱۰)

لیکن آج جس قدر یہ کربنا کی عام ہوگئی ہے، اسی قدر زیرکی کے ساتھ فکر وتدبر کی مثال عنقا ہے، اب تو اسلام پر عمل اور اس کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو اسی پروپیگنڈہ کے سبب ایسی اذیتوں سے گزارا جا رہا ہے جس کی مثال تاریخ میں بھی نہیں ملتی لیکن اس پر جو خاموشی اور جمود دیکھنے میں آیا وہ کسی حیرت ناک واقعہ سے کم نہیں۔ (.....**جاری**)

☆☆☆

❑ قضیۂ فلسطین

# فلسطین کا حق دار کون؟

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

فلسطین کا مسئلہ ایک زمانے سے یہودیوں اور مسلم فلسطینیوں کے مابین اک نزاعی مسئلہ بنا ہوا ہے۔اس کی بنیاد پر نہ جانے کتنی خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں ! نہ جانے کتنے خاندان تباہ ہو چکے ہیں ! اور نہ جانے کتنے ایمان فروش اپنے ایمان کا سودا کر کے رسوائے زمانہ ہو چکے ہیں ! اسرائیل کا دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کا ہے، جبکہ رواں نصف صدی کے غاصبانہ قبضے سے پہلے تاریخ کے کسی دور میں بھی انہیں حاکمانہ اور فاتحانہ حیثیت میں وہاں رہنا، یا بسنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی اس سے گہری وابستگی ابتدائے اسلام سے ہی ثابت ہے۔قرآن پاک کی مشہور سورہ ہے، سورہ اسراء۔اس سورہ کی ابتدا ہی اس بیان سے ہوتی ہے کہ بڑی عظمتوں کا مالک ہے وہ اللہ جو اپنے محبوب بندے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی لے گیا، جس کے گرد وپیش ہماری طرف سے برکتوں کا سایہ رہتا ہے، وہ اسے لے گیا تا کہ وہاں اسے اپنی عظیم نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ ارشاد الٰہی ہے: (سُبحَانَ الّذِی أَسرَی بِعَبدِهِ لَیلاً مِّنَ المَسجِدِ الحَرَامِ إِلَی المَسجِدِ الأَقصَی الّذِی بَارَکنَا حَولَهُ لِنُرِیَهُ مِن آیَاتِنَا إِنّهُ هُوَ السّمِیعُ البَصِیرُ) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی، یعنی بیت المقدس آپ کو لے جانا، دراصل اس بات کا اعلان تھا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالمی نبوت ہے، جس سے مسجد اقصی کا بھی ویسا ہی تعلق ہے، جیسا مسجد حرام کا۔اور عنقریب مسجد حرام اور مسجد اقصی، دونوں کی کنجیاں آپ کے ہاتھوں میں آجائیں گی۔مسجد حرام کی کنجیاں تو فتح مکہ کے بعد ہی آپ کے ہاتھوں میں آگئیں ، اور مسجد اقصی کی کنجیاں دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں آپ کی وفات کے چھ سال بعد مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئیں۔مسجد اقصی کی کنجیاں آپ کے ہاتھوں میں آئیں، یا آپ کے جاں نثاروں کے ہاتھوں میں آئیں، دونوں ایک ہی بات تھی۔سنہ 71 ہجری میں مسلمانوں نے فلسطین کو فتح کیا' اور امیر المومنین حضرت عمر فاروق نے یروشلم کا تاریخی سفر کر کے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے وہاں کے عیسائی پادری سے اس کی کنجیاں حاصل کیں۔اس موقع پر امیر المومنین نے جس خوش اخلاقی، جس کشادہ دلی، جس عالی ظرفی اور جس بے لوثی سے وہاں کے عیسائیوں کے ساتھ معاملہ کیا، اور جیسے بلند اسلامی کردار کا مظاہرہ کیا، اس نے ان سب کا دل جیت لیا، اور ان میں سے بہت سے لوگ اسی وقت اسلام لے آئے۔اس وقت سے مسلم امت کا بیت المقدس سے جو رشتہ قائم ہوا، وہ صدیوں تک قائم رہا، اور اس شان سے قائم رہا کہ فلسطین اسلامی تہذیب کا گہوارہ بن گیا، اور وہاں کے در و دیوار سے اسلامی تہذیب کی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔جب 1096 عیسوی میں اسلام اور مسلم حکومتوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو اس کے نتیجہ میں کچھ مدت کے لیے دوسرے مسلم علاقوں کی طرح فلسطین پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا، اور مسلم امت وہاں سے بے دخل ہو گئی۔مگر یہ محرومی اور زبوں حالی زیادہ دنوں باقی نہیں رہی، جلد ہی وہ وقت آیا، کہ ملت

اسلامیہ کے ایک جسور وغیور، نیک دل اور شیر دل فرزند سلطان صلاح الدین ایوبی کے فلک بوس آہنی عزائم نے ظالم اور خوں خوار صلیبی طاقتوں سے ٹکّر لی، اور اس طرح ٹکّر لی کہ ان کے کبر و نخوت کے شیشے چکنا چور ہوگئے! اس نے یکے بعد دیگرے ان پر تابڑتوڑ حملے کیے، اور اپنی زبردست ایمانی حرارت، اور بے پناہ جنگی مہارت سے ان ظالم وجابر حکومتوں کے پرخچے اڑادیے، بالآخر نوّے (90) سال کے ظالمانہ قبضے کے بعد وہ صلیبی طاقتیں نہایت بے بسی کے ساتھ پیچھے ہٹنے، اور بیت المقدس کو دوبارہ مسلم امت کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگئیں! اس وقت سے لے کر خلافت عثمانیہ کے سقوط تک، یعنی مسلسل کئی صدیوں تک فلسطین کی سرزمین مسلم امت کو اپنی آغوش محبت میں لیے رہی، اور نہایت آب وتاب کے ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتی رہی۔ پھر پہلی عالمی جنگ کے موقع پر 11 دسمبر 1917 عیسوی کی منحوس صبح طلوع ہوئی، اور انگریز اپنے لاؤلشکر کے ساتھ فلسطین میں داخل ہوگئے، اور ناجائز طور پر اس پر قابض ہوگئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد جب انہیں دوسرے ممالک کی طرح فلسطین سے بھی بھاگنا پڑا، تو انہوں نے شرق اوسط میں اپنے گھٹیا مفادات کے تحفظ کے لیے وہاں حکومت اسرائیل کا قیام ضروری سمجھا، حکومت اسرائیل کے لیے انہوں نے فلسطین کا انتخاب کیا، اس لیے کہ ان کے ذلیل استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے فلسطین سے زیادہ موزوں کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی وقت سے انہوں نے فلسطینی مسلمانوں کے خلاف گھناؤنی سازشوں کے جال بننے شروع کردیئے، اور نہایت بے رحمی اور سفّاکی کے ساتھ وہاں کے مسلمانوں کو قتل کرنے، جو وہاں صدیوں سے بسے ہوئے تھے، انہیں وہاں سے بھگانے، اور ان سے فلسطین کو خالی کرانے کی ناپاک مہم شروع کردی۔ ان گھناؤنی سازشوں میں اقوام متحدہ نے ہر طرح سے ان کا ساتھ دیا، اور آج تک نہایت بے شرمی سے ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے، کہ کسی زمانے میں مسلمانوں نے بھی بہت سے ملکوں کو فتح کیا تھا، جس طرح دوسری قومیں مختلف زمانوں میں ملکوں کو فتح کرتی رہی ہیں، مگر مسلمانوں کی فتوحات اور دیگر قوموں کی فتوحات میں بنیادی فرق یہ رہا ہے، کہ دوسری قوموں نے ہمیشہ ملکوں کو فتح کیا ہے انہیں لوٹنے، ان کے خزانوں پر قبضہ کرنے، اور اپنی سلطنت، یا اپنے دائرۂ اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے، چنانچہ اس کے لیے انہوں نے وہاں کے باشندوں کو بے دریغ قتل کیا، ان کی آبادیوں کو نہایت بے دردی سے لوٹا، اور ہر طرح سے ان کی طاقت توڑنے، اور ان کی تعداد گھٹانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس مسلم امت نے جب بھی ملکوں کو فتح کیا ہے، وہاں کی مظلوم رعایا کو ان کے ظالم وجابر بادشاہوں سے نجات دلانے کے لیے فتح کیا ہے، انہوں نے ہمیشہ ظالم بادشاہوں اور ان کی خونخوار فوجوں سے جنگ کی ہے، کبھی رعایا پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ انہوں نے کبھی کسی بوڑھے، کسی کمزور، کسی عورت، اور کسی بچے پر ہاتھ نہیں اٹھایا، نہ کسی بھی طور سے انہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی اور غم خواری کا معاملہ کیا ہے، کبھی انہیں لوٹنے اور اجاڑنے، اور وہاں کی دولت اپنے ملکوں میں منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ حد یہ ہے کہ جن دشمن فوجوں سے انہوں نے جنگ کی ہے، جنگ ختم ہونے، اور ان پر فتح حاصل ہوجانے کے بعد ان کے زخمی فوجیوں کو جان سے مار دینے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں سے ان کی مرہم پٹی کی ہے، حسب ضرورت ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا ہے، اور ہر طرح سے ان کی جان بچانے، نیز ان کے اخلاق سنوارنے، اور انہیں حق کی روشنی دکھانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ مفتوحہ ممالک کی رعایا نے انہیں ہمیشہ اپنے لیے رحمت سمجھا ہے، انہیں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے، اور جب وہاں سے وہ رخصت ہونے لگے ہیں، تو باصرار انہیں روکنے کی کوشش کی ہے، اور اگر وہ رکنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، تو محبت اور تشکر کے گرم گرم آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا ہے! مسلم امت کی فتوحات، اور دوسری قوموں کی فتوحات میں یہ بنیادی فرق ہے، جس کو کبھی

فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ایک جنگ قوموں کے لیے رحمت ہوتی ہے،اور دوسری جنگ عذاب ہوتی ہے،جس سے جنگل کے درندے،اور بلوں میں رہنے والے سانپ بھی پناہ مانگتے ہیں! بہر کیف یہ بات ہمیں کبھی نہیں بھولنی چاہیے، کہ پہلی عالمی جنگ سے پہلے پوری تاریخ میں یہودی قوم کا فلسطین سے کوئی تعلق نہیں رہا،جبکہ مسلم امت کا اس سے تعلق ابتدائے اسلام سے ہے،اور یہ تعلق چند مہینوں اور چند سالوں کا نہیں ، بلکہ مسلسل کئی صدیوں پر مشتمل ہے۔فلسطین سے مسلمانوں کا بس یہی تعلق نہیں کہ وہ ان کا صدیوں پرانا وطن ہے، بلکہ ہجرت مدینہ کے بعد تقریباً سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس ان کا قبلہ رہا ہے،جس کی طرف رخ کرکے وہ اپنی پنجگانہ نمازیں ادا کرتے رہے ہیں۔صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے:(عن البراء بن عازب قال صلينا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم نحو بيت المقدس ستة عشر شهراً، و سبعة عشر شهراً، ثم صرفنا نحو الكعبة) گویا تاریخ کے ایک دور میں مسلم امت کے لیے بیت المقدس کی وہی حیثیت رہی ہے، جو اس سے پہلے، پھر اس کے بعد سے لے کر آج تک، بلکہ قیامت تک کے لیے خانۂ کعبہ کو حاصل رہی ہے،اور حاصل رہے گی۔یہودی قوم کے پاس فلسطین کا حق دار ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے،سوائے اس کے کہ فلسطین اللہ تعالی کے ان بے شمار رسولوں اور نبیوں کا مرکز رہا ہے،جن کا نسبی تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اک زمانۂ دراز تک فلسطین نبوت ورسالت کا مرکز رہا ہے، اور اس نبوت ورسالت کے تاج داروں کی بڑی تعداد بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی تھی۔حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسی ،اور نہ جانے کتنے انبیاء ورسل جن کے نام بھی کسی کو نہیں معلوم، اس لیے کہ قرآن پاک نے ان کی طرف صرف اشارے کیے ہیں، ان کے نام نہیں لیے ہیں، وہ سارے انبیاء ورسل، یا ان میں سے بہت سے لوگ اسی سرزمین مقدس میں مبعوث ہوئے، اور کار نبوت ورسالت انجام دینے کے بعد وہیں پیوند خاک ہوگئے۔یہودی قوم ان میں سے بہتوں کو اپنا نبی کہتی، ان کا وارث ہونے کا دعوی کرتی، اور بطور وراثت اس سرزمین کا حق دار ہونے پر اصرار کرتی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ کے ان نبیوں اور رسولوں سے یہودیوں کو کیا واسطہ؟ یہودی تو ان رسولوں میں سے کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہیں لائے، نہ انہیں برداشت کیا، اس کے برعکس وہ اپنی تاریخ کے ہر دور میں ان سے برسر پیکار رہے! جن کو وہ قتل کرسکے، انہیں قتل کردیا۔جن کو قتل نہیں کرسکے، انہیں جھٹلاتے اور ان کی مخالفت کرتے رہے۔قرآن پاک میں یہودیوں کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:(اَفَكُلَّمَا جَاءكُم رَسُول بِمَا لَا تَهوَى أَنفُسُكُمُ استَكبَرتُم، فَفَرِيقاً كَذَّبتُم وَفَرِيقاً تَقتُلُونَ۔سورة البقرة: 87)(تو کیا ایسا ہے کہ جب جب تمہارے پاس کوئی رسول آیا ایسی تعلیمات لے کر جو تمہاری طبیعت کے خلاف تھیں ،تو تم نے نخوت کا مظاہرہ کیا ،کسی کو تو تم نے جھٹلا دیا، اور کسی کے خون کے پیاسے ہوگئے!) یہاں بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے، کہ کیا انبیائے بنی اسرائیل پر بنی اسرائیل میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ ایسا نہیں ہے، بلاشبہہ اللہ کے ہر نبی اور ہر رسول پر بنی اسرائیل کے تھوڑے یا زیادہ لوگ ایمان لاتے رہے، جن کا ذکر قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے، مگر ایمان لانے کے بعد وہ لوگ یہودی یا عیسائی نہیں رہتے تھے۔وہ اپنے آپ کو مسلم کہتے تھے، اور مسلم ہی کہلانا پسند کرتے تھے۔وہ اپنی قوم کو یہودیت یا عیسائیت کی نہیں، بلکہ اسلام کی دعوت دیتے تھے۔درج ذیل آیات اس سلسلے میں کس قدر واضح ہیں : (وَقَالَ مُوسَى يَا قَومِ اِن كُنتُم آمَنتُم بِاللّهِ فَعَلَيهِ تَوَكَّلُوا اِن كُنتُم مُّسلِمِين۔ سورہ یونس:84)(موسی نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو، تو اس سے اچھی امید رکھو، اگر تم اسلام کے شیدائی ہو!)(حَتّى اِذَا ادرَكَهُ الغَرَقُ

قَالَ آمَنتُ انّـهُ لا اِلٰـهَ اِلاّ الّـذِی آمَنَت بِهِ بَنُو اِسرَائِیلَ وَأَنَـا مِـنَ الـمُسـلِمِین۔یونس :90)(یہاں تک کہ جب وہ فرعون ڈوبنے لگا،تو اس نے پکارا:میں ایمان لایا اس بات پر کہ کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں ،اور میں بھی مسلم امت میں شامل ہوں!)(وَمَـا تَـنـقِمُ مِنّـا اِلاّ أَن آمَـنّـا بِـآیَـاتِ رَبّنَا لَمّا جَاء تنَا رَبّنَا اَفرِغ عَلَینَا صَبراً وَتَـوَفّـنَا مُسلِمِین۔ الاعراف: 126)فرعون کے جادوگروں نے کہا:(ہم پر تمہارا غصہ صرف اس وجہ سے ہے، کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اپنے رب کی آیتوں پر، جب وہ ہمارے پاس آئیں ،اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر انڈیل دے،اور ہماری جان جائے ،اس حال میں کہ ہم مسلم ہوں!)(قَالَت رَبّ اِنّی ظَلَمتُ نَـفسِی وَسـلَمتُ مَعَ سُلَیمَانَ لِلّٰهِ رَبّ العَالَمِین۔ النمل: 44)(ملکۂ سبا نے کہا:اے میرے رب! میں نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا،اور سلیمان کے سایے میں رہتے ہوئے میں بھی اسلام لے آئی اللہ کے لیے،جو سارے انسانوں کا پالنہار ہے۔)(فَـلَـمّـا أَحَسّ عِیسَی مِنهُمُ الکُفرَ قَالَ مَن اَنصَارِی اِلَی اللّٰهِ قَالَ الـحَـوَارِیّـونَ نَحنُ اَنصَارُ اللّٰهِ آمَنّا بِاللّٰهِ وَاشهَد بِاَ نّا مُسلِمُونَ۔آل عمران: 52)(توجب عیسی نے دیکھا وہ کفر پر مصر،یعنی ان کے قتل کے در پے ہیں،تو پکارا:کون ہیں میرے مددگار اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار،ہم ایمان لے آئے ہیں،گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔)(وَاِذ اَوحَیـتُ اِلَـی الـحَوَارِیّینَ اَن آمِنُوا بِی وَبِرَسُولِی قَالُوَا آمَنّا وَاشهَد بِـاَ نّـنَـا مُسلِمُونَ۔ المائد : 111)(یادکرو،جبکہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی، کہ ایمان لے آؤ مجھ پر،اور میرے رسول پر!انہوں نے کہا: ہم ایمان لے آئے،اور گواہ رہیے کہ ہم سب مسلم ہیں۔) ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، کہ بنی اسرائیل میں آنے والے نبیوں اور رسولوں نے کبھی بھی یہودیت یا عیسائیت کی دعوت نہیں دی،بلا استثناء وہ سب مسلم تھے، اور ان سب نے اپنی قوم کو اسلام کی ہی دعوت دی۔اس طرح جو لوگ ان پر ایمان لائے، وہ سب مسلم کہلائے،اور جو لوگ ایمان نہیں لائے ،وہ اپنی یہودیت یا عیسائیت پر نازاں رہے،اور اپنے آپ کو یہودی یا عیسائی کہتے کہلاتے رہے۔اس موقع پر کوئی بھی ہوشمند اور عاقل انسان بآسانی یہ فیصلہ کرسکتا ہے،کہ ان انبیاء ؑ ورسل کے وارث یہودی ہوں گے، یا مسلم امت ہوگی؟ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: (اِنّ اَولَـی الـنّاسِ بِاِبرَاهِیمَ لَلّذِینَ اتّبَعُوهُ وَهَذَا النّبِیّ وَالّـذِیـنَ آمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِیّ المُؤمِنِینَ۔ آل عمران: 68) (ابراہیم سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی، نیز اس سے سب سے زیادہ قریب یہ نبی ہے، اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے ہیں ،اور اللہ ان مومنین کا سرپرست ہے) یہودی قوم نہ صرف یہ کہ ان نبیوں اور رسولوں کی کسی بھی طور سے وارث نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ ان سب کی دشمن ہے،لہذا ان میں سے کسی کا نام لینے کا بھی اسے حق نہیں۔یہ بلا استثنا ان تمام رسولوں اور نبیوں کی دشمن ہے،اور خود حضرت موسی کی بھی دشمن ہے،جن کا وہ نام لیتی،اور جن کی لائی ہوئی تورات کا وہ حوالہ دیتی ہے۔اس قوم نے حضرت موسی علیہ السلام کو کتنا تنگ کیا ہے،اور کس کس طرح انہیں اذیت پہنچائی ہے،اس کا ذکر جگہ جگہ قرآن پاک میں موجود ہے،ایک جگہ ارشاد ہے: (یَـاَیّهَـا الّـذِیـنَ آمَنُوا لَا تَکُونُوا کَـالّـذِیـنَ آذَوا مُـوسَی فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمّا قَالُوا وَکَانَ عِندَ اللّـٰهِ وَجِیهـاً۔سورہ احزاب: 69)(اے وہ لوگو!جو ایمان لائے ہو،تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا، جنہوں نے موسی؟ کو اذیت پہنچائی،تو اللہ نے بچالیا اسے ان کی اذیتوں سے، وہ اللہ تعالی کے ہاں بڑے رتبے والا تھا۔) ایک دوسری جگہ خود حضرت موسی؟ نے اپنی قوم سے اسی بات کا شکوہ کیا ہے:(وَاِذ قَـالَ مُـوسَـی لِـقَـومِـهِ یَـا قَـومِ لِمَ تُؤذُونَنِی وَقَد تّعلَمُونَ اَنّی رَسُولُ اللّـٰهِ اِلَیکُم.سورہ الصف: 5) (اور یاد کرو اس وقت کو جب موسی نے اپنی قوم سے کہا:اے میری قوم !تم کیوں مجھے اذیت

پہنچاتے ہو؟ جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں!) اس قوم نے جب حضرت موسی علیہ السلام کی قدر نہیں کی، تو وہ ان کی لائی ہوئی تورات کی قدر کیا کرتی ؟ چنانچہ اس نے پوری ڈھٹائی سے اس پر تحریف کی قینچی چلائی، اور اسے اپنی نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لیا! یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس وقت یہودی قوم کے ہاتھوں میں جو تورات ہے، یہ وہ تورات نہیں جو حضرت موسی علیہ السلام لائے تھے، حضرت موسی علیہ السلام جو تورات لائے تھے، وہ تورات اس سے بالکل مختلف تھی! اس میں بہت سی وہ باتیں ہیں، جو اس میں نہیں تھیں، اور بہت سی وہ باتیں جو اس میں تھیں، اس میں نہیں ہیں۔ ضروری ہے کہ ان باتوں کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں، اس لیے کہ ان کے سلسلے میں بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آج ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو حضرت موسی، حضرت داؤد، اور حضرت سلیمان علیہم السلام کو یہودیوں کا نبی کہتے ہیں! حالانکہ یہ سب نبی ہمارے ہیں، یہودیوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ رسولوں اور نبیوں کا تعلق کبھی نسل وقرابت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ ایمان وتقوی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جو گروہ ان کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل پیرا، اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوگا، وہی ان کا وارث ہوگا، اور جو ان کے راستے سے ہٹا ہوا، اور ان کی تعلیمات سے بے زار ہوگا، اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ آج ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو یہودیت اور عیسائیت کو آسمانی مذاہب شمار کرتے ہیں، حالانکہ یہودیت اور عیسائیت کا وحی ورسالت، یا خدا اور اس کے رسولوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالی کے ہاں سے آیا ہوا دین بس ایک دین ہے، دین اسلام۔ اللہ تعالی نے اپنی پیاری کتاب میں صاف صاف اس کا اعلان فرمادیا ہے۔ ارشاد الہی ہے: (ان الدین عند اللہ الاسلام) یعنی ''اللہ کے نزدیک دین بس اسلام ہے۔'' اسلام کے علاوہ جتنے بھی ادیان اور جتنے بھی مذاہب ہیں، وہ انسانوں کے خود اپنے بنائے ہوئے ہیں، ان ادیان ومذاہب کو اختیار کرکے انسان کبھی بھی اپنے رب کو نہیں پاسکتا، نہ کبھی فلاح وکامرانی کا منہ دیکھ سکتا۔ اس طرح یقینی طور پر یہودیت اور عیسائیت کی بالکل وہی حیثیت ہے، جو دنیا کے دوسرے ازموں اور دوسرے انسانی مذاہب کی ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود، چونکہ دین اسلام سارے انسانوں کے رب کا بھیجا ہوا دین ہے، اور وہ سارے انسانوں کی رہنمائی اور خیر خواہی کے لیے آیا ہے، اس وجہ سے اس میں کسی طرح کی تنگی نہیں ہے، اس کا سینہ سب کے لیے کشادہ ہے۔ اگر یہودی آج بھی اپنی اسلام دشمنی، اور مسلم دشمنی سے باز آجائیں، اور فلسطین کے معزز شہریوں کی حیثیت سے فلسطین میں رہنا چاہیں، تو مسلم قوم کو وہ دوسروں سے زیادہ عالی ظرف اور فراخ دل پائیں گے؛ لیکن اگر وہ مسلم امت کی غیرت وحمیت، اور اس کے وقار کو چیلنج کرتے ہیں، اور ظلم وبربریت سے اس کے کسی خطۂ زمین پر قبضہ کرکے اسے یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں، تو مسلم امت کسی بھی حال میں یہ ذلت برداشت نہیں کرسکتی، وہ آخر دم تک اس کے لیے لڑتی رہے گی۔ اگر مسلم امت کے سروں پر مسلط کچھ حکمرانوں اور بادشاہوں کا خون سفید ہوگیا ہے، تو اس سے اسرائیل کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے! اسرائیل کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، کہ آج بھی مسلم امت کی رگوں میں دوڑنے والا خون نہایت سرخ ہے، اور ایمانی حرارت سے کھول رہا ہے، وہ اسلامی مقدسات کے تحفظ کے لیے ہر بازی کھیل سکتی، اور اپنی قیمتی سے قیمتی متاع کو داؤں پر لگا سکتی ہے! وہ اپنے سروں پر مسلّط ظالم وجابر اور اسلام دشمن حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی عاجز آچکی ہے، اور اللہ تعالی کی مدد شامل حال رہی، تو وہ وقت دور نہیں جب وہ ان سب کو اپنے پیروں سے روند کر سارے عالم کے لیے نمونۂ عبرت بنادے گی!

☆☆☆

❑ شخصیات

# حضرت شیخ یونسؒ کی کہانی، خود ان کی زبانی

ترتیب وپیشکش: محمد حماد کریمی ندوی
ایڈیٹر مجلّہ النصیحہ، مرڈیشور، بھٹکل

## تمہید:

حق تعالی شانہ نے اپنے آخری دینِ متین کو حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرما کر اسے قیامت تک کے لئے محفوظ فرمانے اور اعداء دین کی شر پسندیوں سے بچانے کا خود ہی وعدہ اور انتظام فرمادیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾ (سورۂ حجر:۹) ترجمہ: ''ہم نے یہ نصیحت نامہ اتارا ہے، اور ہم نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے''، اور ارشاد ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِه وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾ (سورۂ توبہ:۳۲) ترجمہ: ''یہ اپنے پروپیگنڈہ اور زبانی مہم کے ذریعہ اللہ کی روشنی بجھا دینا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، چاہے ان منکروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو''، اور اسی دین متین کی تشریح احادیث رسول ﷺ ہیں، جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (سورۂ قیامہ:۱۹) ترجمہ: ''پھر اس کی وضاحت وتفسیر بھی ہماری ذمہ داری ہے''۔

البتہ اسبابِ ظاہری کے طور پر اس کی حفاظت کا کام اپنے بندوں سے لیا، چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ وحروف اور اس کو صحت سے پڑھنے کا التزام حفاظ وقراء کرام سے کروایا، اور اس کے معانی کی حفاظت مفسرین کرام سے اور احادیث رسول ﷺ کی حفاظت محدثین عظام سے، اور دونوں سے معانی واحکام کا استنباط فقہاء کرام سے کروایا۔

حفاظت کے دو طریقے ہیں: (۱) حفظ، (۲) کتابت۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے شاگردوں کی پہلی جماعت یعنی صحابہ کرام اور پھر درجہ بدرجہ خیر القرآن کے حافظے اس قدر قوی تھے کہ جو سنتے من وعن وہ محفوظ ہوجاتا، اور پھر انہیں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ اس قدر محبت وعشق تھا کہ آپ کی ہر ہر ادا اور کیفیتِ بیان تک کو محفوظ رکھا، اور پھر اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اگلوں تک بھی پہنچادیا، اور اس کا خود رسول ﷺ نے حکم دیا، چنانچہ ارشاد ہے: (أَلاَ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ)، اور ارشادِ نبوی ہے: (نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ، فَحَفِظَهَا، وَوَعَاهَا، وَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى لَهُ مِنْ سَامِعٍ)، پھر جب حفظ میں کمزوری آنی شروع ہوئی تو اس کی جگہ کتابت نے لے لی، اور کتابت حدیث بھی خود رسول اللہ ﷺ کے دور سے ثابت ہے، اور آج تک اس کا تعامل جاری ہے۔

اب ممکن تھا کہ کوئی فضائل کی تحصیل کے شوق میں ہر رطب ویابس روایت کرنا شروع کردے، جس سے خلل فی الحدیث واقع ہوتو اس کا سدباب ﴿يَأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ جَائَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (سورۂ حجرات:۶) ترجمہ: ''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر متقی کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو'' کے عام حکم سے اور (مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ) کے خاص حکم سے کردیا، جس کی وجہ سے ائمہ جرح

وتعدیل اور محدثین کرام نے وضع حدیث کے تمام راستوں کو بند کردیا، اور چودہ صدی گذرنے کے باوجود آج بھی صحیح وضعیف اور موضوع ومکذوب روایات میں امتیاز سہل ہوگیا۔

الحمدللہ ہر صدی میں ایسے اصحاب الجرح والتعدیل اور محقق علماء محدثین موجود رہے، اور نہ صرف عرب اور اسلامی ممالک میں بلکہ عجم وہند میں ایسے علماء کثیر تعداد میں رہے ہیں، جنہوں نے محنت کرکے دودھ کا دودھ اور پانی پانی کردیا۔

ماضی قریب میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کے بعض تلامذہ، اسی طرح حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اسی شان کے محدثین میں سے تھے۔

عہدِ حاضر میں حضرت مولانا شیخ محمد یونس صاحب جونپوری اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھے۔ (ماخوذ باختصار، ازعرض مرتب بر کتاب الیواقیت الغالیۃ، بقلم: محمد ایوب سورتی، ص: ۱۵و۱۶)

مولانا ایشیا کے عظیم الشان ادارہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کی مسندِ درس پر تقریباً چالیس سال سے فائز رہے، اور ہزاروں تشنگانِ علم ومعرفت کی پیاس بجھاتے رہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی حیات ہی میں آپ پر اعتماد فرما کر بخاری شریف کی تدریس کی خدمت آپ کے سپرد فرمادی تھی، پھر کچھ دن کے بعد بیعت وارشاد کی بھی اجازت مرحمت فرمادی تھی۔

برصغیر میں بخاری شریف کا درس معیارِ فضل وکمال ہی نہیں، بلکہ علم وفضل اور تقدیس وپاکیزگی کا بھی امین سمجھا جاتا ہے، آپ کی ذاتِ گرامی یقیناً فضل وکمال، علم وعمل، تقوی وطہارت، صبر وقناعت، توکل ورضا، خوف وخشیت اور انابت الی اللہ کی ایک جامع ومکمل تصویر تھی۔

تمام علوم وفنون میں آپ کو مرجعیت کا مقام حاصل تھا، خصوصاً علمِ حدیث میں تو آپ ہندستان وایشیا ہی میں نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام میں اس وقت سند کا درجہ رکھتے تھے، بہت سے علماء ومحدثین مختلف مقامات سے حاضر خدمت ہوتے رہتے تھے، اور آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے تھے، نیز اپنے علمی اشکالات پیش کرکے ان کا حل طلب کرتے تھے، اور یہاں آکر انہیں تشفی ہوجاتی تھی، بہت سے علمائے عرب بھی آپ سے مراجعت کرتے تھے، اور بہت سے حدیث سے شغف رکھنے والے آپ سے سند حاصل کرنے کو اپنے لئے باعث فضل وکمال سمجھتے تھے۔

دیگر علوم وفنون کے مقابلہ میں حدیث کا علم غیر معمولی ہے اس میں ان تمام روات کے احوال سے باخبر ہونا ضروری ہے، جن کے ذریعہ یہ علم پہنچا ہے، پھر ان لکھوکھا افراد کی زندگی کی تفصیلات، ان اکا مزاج ومذاق، ان کا کردار، معاصرین کا ان کے بارے میں خیال کہ وہ ثقہ یا کامل الضبط ہیں یا نہیں وغیرہ، یہ خود ایک مستقل فن ہے۔

اس فن پر آپ کی گرفت تھی، یہ فضلِ الٰہی اور امتیازی خصوصیت ہے جو حق تعالی شانہ کی طرف سے آپ کو ودیعت کی گئی تھی، متنِ حدیث، سندِ حدیث، اور حدیث کے مقتضیات ومطالبات اور اس کے معانی ومفاہیم پر نہ یہ کہ آپ کو گرفت تھی، بلکہ بفضل ایزدی اس کا القاء ہوتا تھا، آپ کی تحقیقات، روایت ودرایت پر نقد، وسعتِ مطالعہ اور متقدمین ومتاخرین کی کتابوں پر بھرپور نقد وتبصرہ اور علامہ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے جبل العلم فی الحدیث کے مسامحات کا تذکرہ، یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس نے پوری بصیرت، انہماک، عشق کے سوز اور مجتہدانہ فراست کے ساتھ پورے ذخیرۂ احادیث کو کھنگال ڈالا ہو۔

دراصل ابتداہی سے آپ نے علم حدیث کے ساتھ اشتغال رکھا، آپ خود فرماتے تھے کہ اگر مجھے کسی سے کچھ پیسے میسر آجاتے تو ان سے حدیث کی کتابیں خرید لیتا، اب آپ کی قیام گاہ پر اپنا ذاتی علم حدیث کا اتنا بڑا کتب خانہ ہے کہ شاید ہی برصغیر میں کسی کے پاس ہو۔

آخری دور میں تو آپ نے عوام وخواص سے کچھ ملنا جلنا بھی شروع کردیا تھا، اور آپ کی خدمت میں جو حاضر ہوتے، ان کی اصلاح وتربیت، تزکیۂ روحانی، اور ان کی اخلاقی حالت پر توجہ

فرماتے تھے، ورنہ اس سے قبل تو آپ نے اپنے آپ کو درس ومطالعہ کے لئے وقف کررکھا تھا۔

آپ کو صرف فن حدیث ہی پر مکمل گرفت نہیں، یہ تو آپ کی امتیازی خصوصیت تھی، بلکہ دیگر علوم وفنون، صرف ونحو، عروض ومعانی، نقد وبلاغت، منطق وفلسفہ، کلام وعقائد، زبان وادب، فقہ وتفسیر وغیرہ میں بھی مکمل درک تھا۔

آپ نے ابتدا میں حدیث کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں پڑھائی ہیں، اوران فنون کا حق ادا کیا ہے، اس کے علاوہ تاریخ وجغرافیہ، سیر وسوانح، اور قوموں وملکوں کے حالات پر بھی آپ کی گہری نظر تھی، جب بھی مجلس میں کوئی موضوع زیر بحث آجاتا، اس پر سیر حاصل مواد میسر ہوتا تھا۔

برِصغیر، مشرقِ وسطی، عالمِ اسلام اور دنیا کے حالات پر آپ کی گہری نظر تھی، کسی بھی گوشہ میں جو حالات پیش آتے تھے، ان پر آپ کا دل دھڑکتا اور بے چینی محسوس کرتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالی نے آپ کو بے شمار خصائص وامتیازات عطا فرمائے تھے، ملت کو آپ کی ذات سے نفعِ کثیر حاصل ہورہا تھا۔(ماخوذ باختصار، الیواقیت الغالیہ، و:۲۱تا۲۴)

آپ کے حالات زندگی آپ ہی کے دست مبارک سے ''ایک خودنوشت مرقع'' کے نام سے لکھے ہوئے ہیں، اسی کی تلخیص پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

## ایک خود نوشت مرقع

**اسم گرامی:** محمد یونس

**ولادت:** تاریخ پیدائش: صبح ۷/بجے بروز دوشنبہ ۲۵/رجب ۱۳۵۵ھ ۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء۔

**طفولت وتعلیم:**

ابتداءً جب عمر چھ سات سال کے مابین ہوئی، اپنے شوق سے ایک مکتب میں جانا شروع کیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ والدہ مرحومہ کا تو انتقال ہوگیا تھا، جبکہ میری عمر ۵ سال ۱۰ ماہ کی تھی، نانی کے پاس رہتا تھا، وہ چھوٹے ماموں کو مکتب جانے کیلئے مار رہی تھی، میرے منہ سے نکل گیا کہ ہم بھی پڑھنے جائیں گے، اسی وقت کھانا پک گیا اور ڈیڑھ میل پر ایک مکتب تھا جہاں بڑے ماموں کے ساتھ بھیج دیئے گئے، مگر راستہ میں تھک گئے تو ماموں نے کاندھے پر اٹھایا، تھوڑی دور چل کر اتار دیا، اسی طرح کبھی اٹھا لیتے اور کبھی اتار دیتے، سارا راستہ قطع ہوگیا مگر بچپن کی وجہ سے پڑھنا نہیں ہو سکا، صرف کھیل کود کام تھا، پھر ایک اور مکتب میں بیٹھے، وہاں کچھ قاعدہ بغدادی پڑھا، ماموں صاحب نے پڑھنا چھوڑ دیا تو ہمارا پڑھنا بھی چھوٹ گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد ایک پرائمری اسکول ہمارے گاؤں میں قائم ہو گیا، اس میں جانے لگے، درجہ دوم تک وہاں پڑھا، پھر درجہ سوم کیلئے مانی کلاں کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا، سوم پاس کرنے کے بعد والد صاحب نے یہ کہہ کر چھڑا دیا کہ انگریزی کا دور نہیں اور ہندی میں پڑھانا نہیں چاہتا۔

ایک دلچسپ قصہ پیش آیا کہ میں اپنے طور پر ہندی کی پہلی کتاب پڑھ رہا تھا، اس میں لکھا ہوا تھا کہ ''طوطا رام رام کرتا ہے''، والد صاحب نے جب مجھ کو پڑھتے سنا تو فرمایا: ''کتاب رکھ دو، بہت پڑھ لیا''۔

اس کے بعد تقریباً دو سال تعلیم کی چھٹی رہی۔

**علاقہ کا حال:**

علاقہ میں عام طور سے جہالت تھی، لیکن عام طور پر لوگ صحیح العقیدہ اور دین کی طرف مائل تھے۔

میرے نانا مرحوم تو میری والدہ کی ولادت سے غالباً پہلے وفات پاگئے تھے، پھر نانی مرحومہ کی دوسری شادی میرے دادا مرحوم کے بڑے بھائی سے ہوئی، جن کو ہم ساری عمر اپنا نانا سمجھتے رہے، اور وہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے، وہ بچپن سے نمازی اور دین دار تھے، عام طور سے برما رہا کرتے تھے، وہاں کوئی عالم رہتے

تھے، جو حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سلسلے میں منسلک تھے، ان سے اچھا تعلق تھا، جس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے گاؤں میں تعزیہ بنتا تھا، جس میں ہمارے خاندان کے بعض لوگ شریک ہوتے تھے، سنا ہے کہ دادا مرحوم بھی شرکت کرتے تھے، مگر نانا مرحوم نے ڈھول وغیرہ توڑ ڈالے، اوراس بدعت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوگیا۔

والد صاحب تو ہمیشہ ہی بدعت سے دور رہے، لیکن ایک چیز کوئی بھی بدعت نہیں سمجھتا تھا، وہ مولود شریف اور قیام تھا، حضرت اقدس مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کی جب آمد ورفت شروع ہوئی تو ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہوگیا۔

مجھے اپنے بچپن کا واقعہ یاد ہے جب میری عمر ۹، ۱۰ سال کی ہوگی، میں بچوں کے ساتھ مولود کی مجلس کرتا تھا، ہماری بیل گاڑی تھی، اس پر ہم عمر تین چار بچے جمع ہوجاتے، اور ہم سب سے بڑے علامہ سمجھے جاتے اور مولود پڑھتے، اور پڑھتے کیا، صرف کھڑے ہوکر درود و سلام پڑھ لیتے اور اس کے بعد گھروں سے جو کھانا وغیرہ لاتے وہ مل کر سب کھا لیتے اور مجلس برخواست ہوجاتی۔

اپنے علامہ سمجھے جانے کا ایک دل چسپ قصہ لکھتا ہوں، میں اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا، نو سال کی عمر ہوگی، ماسٹر صاحب موجود نہیں تھے، تھوڑی دیر میں دیکھا ایک جنازہ قریب کے قبرستان میں لایا گیا اور اس کو دفن کیا جانے لگا، ہم نے سب لڑکوں سے کہا کہ ہم نے نماز جنازہ نہیں پڑھی، جلدی سب لوگ وضو کرلیں، سب نے وضو کیا اور ہم نے نماز جنازہ پڑھائی، نامعلوم کیا ہوا دوبارہ پڑھائی، غالباً سہ بارہ بھی، اور یہ سب مکتب میں ہورہا تھا، جو اس وقت گاؤں سے باہر ایک شخص کی ایک عمارت میں تھا، جہاں ان کے بیل اور مزدور رہتے تھے۔

### بچہ کا خطبہ، بڑے کی امامت:

ایک اور دل چسپ قصہ لکھ دوں، ہمارے گاؤں میں جمعہ ہوا کرتا تھا، ہم سب سے پہلے غسل کرکے پہنچ جاتے تھے اور خطیب صاحب کی نقل اتارا کرتے تھے، ایک مرتبہ اتفاق سے خطیب صاحب موجود نہ تھے اور گاؤں کے بڑے بوڑھے موجود تھے، جن میں میرے نانا بھی تھے، میری عمر ۹، ۱۰ سال سے زیادہ نہ ہوگی، کوئی پڑھا لکھا نہ تھا، صرف قرآن شریف پڑھے ہوئے تھے، اس کے علاوہ کچھ پڑھ نہیں سکتے تھے، حضرت عمرو بن سلمہ الجرمیؓ کی طرح ہم ہی اس وقت سب سے بڑے پڑھے لکھے تھے، ایک صاحب نے ہمیں حکم دیا:

''چل منبر پر اور خطبہ پڑھ''۔

ہم بے خوف چڑھ گئے اور خطبہ شروع کردیا، ایک جگہ تو ذرا اٹک سی ہوگئی، باقی الحمدللہ صاف ہی پڑھا گیا، نماز ایک دوسرے صاحب نے پڑھائی، ہماری نانی صاحبہ اور دوسرے اعزہ اس سے بہت مسرور ہوئے، مگر خیال یہ پڑتا ہے کہ خطبہ ایک ہی ہوا تھا۔

### گاؤں کا حال:

ہمارے گاؤں سے تین میل کے فاصلہ پر مانی کلاں میں جامع مسجد میں تو حفظ پڑھایا جاتا تھا اور اتنا بابرکت درس تھا کہ سینکڑوں حفاظ پیدا ہوئے، ہمارے مختصر سے گاؤں میں جس کی اس وقت کی مسلم آبادی زیادہ سے زیادہ پندرہ مکانات پر مشتمل تھی اس میں چھ حفاظ تھے، وہیں مدرسہ ضیاء العلوم تھا، جس میں ہماری ابتدائی تعلیم ہوئی، ہمارے گاؤں میں سب سے پہلے اس مدرسہ میں مولوی نور محمد صاحب نے پڑھا، جن سے ہم نے تعلیم الاسلام کے کچھ اسباق پڑھے، وہ پھر پاکستان چلے گئے۔

### عربی کی تعلیم:

پھر تقریباً ۱۳ سال کی عمر میں مدرسہ ضیاء العلوم قصبہ مانی کلاں میں داخلہ ہوا، ابتدائی فارسی سے لے کر سکندر نامہ تک اور پھر ابتدائی عربی سے لے کر **مختصر المعانی، مقامات وشرح وقایہ ونورالانوار** تک وہیں پڑھیں۔

اکثر کتابیں استاذی مولانا ضیاء الحق صاحب سے اور شرح جامی بحث اسم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ سے، مگر کثرت امراض کی وجہ سے بیچ

میں طویل فترات واقع ہوتی رہیں، اس لئے تکمیل کافی مؤخر ہوگئی۔

پھر یہ بھی پیش آیا کہ ہماری جماعت ٹوٹ گئی، ہم نے اولاً شرح جامی، شرح وقایہ، نورالانوار مولانا ضیاء الحق صاحب سے پڑھی تھیں، مگر جماعت نہ ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نے اگلے سال پھر انھیں کتابوں میں داخل کر دیا اور خود پڑھایا۔

**مظاہر علوم میں داخلہ:**

اس کے بعد شوال ۱۳۷۷ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں بھیج دیا، یہاں آ کر پہلے سال جلالین، ہدایہ اولین، میبذی اور اگلے سال بیضاوی، سلّم، ہدایہ ثالث، مشکوۃ شریف اور تیسرے سال یعنی شوال ۱۳۷۹ھ تا شعبان ۱۳۸۰ھ دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، اور اس سے اگلے سال کچھ مزید کتابیں ہدایہ رابع، صدرا، شمس بازغہ، اقلیدس، خلاصۃ الحساب، درمختار پڑھیں۔

**مظاہر علوم کی مسند تدریس پر :**

شوال ۱۳۸۱ھ میں معین المدرس کے عہدہ پر تقرر ہوا، وظیفۂ طالب علمی کے ساتھ سات روپیہ ماہانہ ملتا تھا، شرح وقایہ اور قطبی زیر تعلیم و تدریس تھیں، اگلے سال بھی یہی کتابیں رہیں اور وظیفہ ۱۰ روپے ماہانہ ہوگیا، اس سے اگلے سال تیس روپے خشک (یعنی بلا طعام) پر تقرر ہوا، اور مقامات و قطبی سپرد ہوئیں، اور اس سے اگلے سال یعنی چوتھے سال شوال ۱۳۸۴ھ سے ہدایہ اولین، قطبی واصول الشاشی زیر تدریس تھیں۔

**درس حدیث :**

اسی سال ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ میں حضرت استاذی مولانا امیر احمد صاحب نوراللہ مرقدہ کا انتقال ہوجانے کی وجہ سے مشکوۃ شریف استاذی مفتی مظفرحسین صاحب کے یہاں سے منتقل ہو کر آئی، جو باب الکبائر سے پڑھائی، پھر آئندہ سال شوال ۸۵ھ میں مختصر المعانی، قطبی، شرح وقایہ، مشکوۃ شریف مکمل پڑھائی، اور شوال ۸۶ھ میں ابوداؤد شریف ونسائی شریف ونورالانوار زیر تعلیم رہیں، اور شوال ۸۷ھ سے مسلم شریف، نسائی وابن ماجہ وموطئین زیر درس رہیں۔

**شیخ الحدیث کے منصب پر :**

اس کے بعد شوال ۱۳۸۸ھ میں بخاری شریف ومسلم شریف وہدایہ ثالث پڑھائی، ولـلّٰه الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه ومباركاً عليه، اس کے بعد سے بحمداللہ سبحانہ وتعالی بخاری شریف اور کوئی دوسری کتاب ہوتی رہتی ہے۔

**امراض کے باوجود علمی شغل :**

میں مسلسل بیمار رہا، مظاہر علوم آنے کے چند دن بعد نزلہ و بخار ہوگیا اور پھر منہ سے خون آ گیا، حضرت اقدس ناظم (مولانا اسعد اللہ) صاحب نوراللہ مرقدہ کا مشورہ ہوا کہ میں گھر واپس ہو جاؤں، لیکن میں نے انکار کر دیا، حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ واعلی اللہ مراتبہ نے بلا کر ارشاد فرمایا کہ: ''جب تو بیمار ہے اور لوگوں کا مشورہ بھی ہے تو مکان چلا جا''، میں نے عرض کیا جو اب تک یاد ہے، کہ: ''حضرت! اگر مرنا ہے تو یہیں مر جاؤں گا'' حضرت نے فرمایا کہ: ''بیماری میں کیا پڑھا جائے گا؟'' میں نے عرض کیا، اور اب تک الفاظ یاد ہیں کہ: ''حضرت! جو کان میں پڑے گا وہ دماغ میں اتر ہی جائے گا'' اس پر حضرت قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ ''پھر پڑا رہ''۔

یہ ہے حضرت قدس سرہ سے پہلی بات چیت، اس کے بعد ہم تو بہت بیمار رہے، اور گاہ بگاہ جب طبیعت ٹھیک ہوجاتی تو اسباق میں بھی جاتے رہتے، انھیں ایام میں حضرت اقدس مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کو اپنی بیماری کا خط لکھا، مولانا نے جواباً لکھا کہ یہ کیا یقین ہے کہ ''خون پھیپڑے سے آیا ہے؟'' اس سے طبیعت کو کچھ سکون ہو گیا، لیکن سینے میں درد رہا کرتا تھا۔

یہ بات اور بھی لکھ دوں کہ جن ایام میں طبیعت خراب تھی، کبھی کبھی دارالحدیث کے شرقی جانب بیٹھ کر حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ کا درس سنتا اور سوچا کرتا تھا کہ نامعلوم ہم کو بھی بخاری شریف پڑھنی نصیب ہوگی یا نہیں؟ اور رویا کرتا تھا، اس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے

کہ اس نے توفیق عطا فرمائی اور پڑھنے کی منزل گزر گئی، اور اللہ تعالی نے محض اپنے فضل و کرم سے پڑھانے کی توفیق بخشی، حالات کی ناسازگاری سے جس کی توقع بھی نہیں تھی، لیکن سب فضل و کرم ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی!

امراض کے تسلسل کی وجہ سے شادی کی ہمت ہی نہ ہوئی اور اب بڑھاپا شروع ہو چکا، حدود خمسین کے آخری سالوں میں چل رہا ہوں، اب اپنی بیماریوں کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر ہوتا کیا ہے، وقت گزر گیا۔

## حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی پہلی زیارت :

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا نام نامی تو مدرسہ ضیاء العلوم میں اپنے اساتذہ اور خاص طور سے استاذی حضرت اقدس مولانا عبد الحلیم صاحبؒ سے سنا، پھر جب سہارنپور بغرض تکمیل حاضر ہوئے تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت ہوئی، سب سے پہلی زیارت کی شکل یہ ہوئی کہ میں کسی ضرورت سے مدرسہ کے دفتر میں گیا تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھا، ایک سادہ کرتا پہنے ہوئے تھے جس کا رنگ زرد تھا، غالباً ڈوریا کا ہوگا، لیکن بات چیت نہیں ہوئی، بات چیت تو بیماری کے وقت ہوئی، اس کی ابتداء میں تردد ہے کہ پہلے وہ واقعہ پیش آیا جو اولاً لکھا گیا یا دوسرا واقعہ جو لکھ رہا ہوں۔

## "وہ تو بہت پکا تھا تو تو بہت کچا ہے":

ہمیں جذبہ پیدا ہوا کہ حضرت نور اللہ مرقدہ سے دعا کروانی چاہئے، حضرت مغرب کے بعد طویل نوافل پڑھتے تھے، ہم بیٹھ گئے، ایک صاحب نے غالباً بیعت کی درخواست دے رکھی تھی، حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے سلام پھیرا اور فارغ ہو کر فرمایا: ''آبھائی''۔

ہم نے سمجھا کہ شاید ہمیں بلا رہیں، ہم آگے بڑھ گئے، حضرت نے فرمایا: ''تو نہیں''، ہم بلبلا کر رو پڑے۔

بہر حال پہلے حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ان صاحب کی ضرورت پوری کی، اس کے بعد احقر کا ہاتھ پکڑا، اور ساتھ لے کر کچے گھر چلے اور حال پوچھتے رہے اور بیماری کا تذکرہ کرتے رہے، حضرت نے پوچھا کہ: ''تو کہاں سے پڑھ کر آیا ہے؟''

میں نے عرض کیا ''مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں'' سے۔

حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا: ''کس سے پڑھا؟''

عرض کیا ''حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب سے'' فرمایا: ''وہ تو بہت پکا تھا، تو تو بہت کچا ہے''۔

اس کے بعد حضرت نے برف کا ٹھنڈا پانی جس میں عرق کیوڑہ ملا ہوا تھا، نوش فرمایا اور کچھ بندہ کے لئے بچا دیا، مگر زیادہ آنا جانا نہیں رہا۔

## دستر خوان پر اکرام :

اصل جان پہچان اس وقت ہوئی جب بندہ کا قیام دفتر میں ہو گیا۔

رمضان شریف میں میں اپنی سحری الگ کھا لیتا تھا، ایک رات خواب دیکھا کہ مولانا اکرام الحسن صاحب مرحوم والد ماجد حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ بندہ کی طرف متوجہ ہیں اور کچھ بات کر رہے ہیں، اسی رات سحری میں حضرت نے بلوایا اور جب کوئی اکرام کی صورت ہونے والی ہوتی تو مولانا اکرام صاحب کو دیکھا کرتے تھے، بہر حال حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بلوا کر فرمایا کہ:

''مجھے معلوم ہوا کہ تو تنہا ہی سحری کھا لیتا ہے، دیکھ! سحری ہمارے ساتھ کھا لیا کر اور اپنی سحری مولوی نصیر کو دے دیا کر'' اور پھر فرمایا: ''سحری کھالی؟''

میں عرض کیا جی ہاں، فرمایا: ''اور کھائے گا؟'' عرض کیا میں کھا چکا ہوں، فرمایا: ''اور کھانے پر بھی تو کھایا جاوے'' ہم بیٹھ گئے، اس کے بعد روزانہ حضرت نور اللہ مرقدہ کے دستر خوان پر سحری میں حاضر ہو جاتے، اس زمانہ میں حضرت کے یہاں سحری میں پلاؤ کے ساتھ گھی لگی ہوئی روٹیوں کا دستور تھا، حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ پوچھا: ''گھی چپڑی روٹی مل گئی؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! حضرت

نے پوچھا ''کتنی آئی؟'' میں نے عرض کیا: ایک، حضرت نے دوسری سرکا دی، اس کے بعد سے ہمارے لئے دو کا دستور ہو گیا۔

**دلچسپ بحث :**

ایک مرتبہ دیر سے پہنچا اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے ایک بحث بھی کی، جس کا افسوس اب تک ہے۔

حضرت نے پہنچتے ہی فرمایا کہ ''خالی جگہ نہیں! بیٹھ جا'' میں نے کہا بیٹھ کر کیا کروں گا؟ فرمایا: ''قل ھو اللہ پڑھ کر ایصال ثواب کر'' میں نے پوچھا کسے؟ فرمایا: ''مجھ کو'' عرض کیا زندوں کو؟ تو نے مشکوۃ شریف نہیں پڑھی؟'' عرض کیا پڑھی تو ہے، فرمایا ''مسجد عشّار والی روایت نہیں پڑھی؟'' عرض کیا: پڑھی تو ہے، پوچھا کہ ''کہاں ہے؟'' میں نے عرض کیا مشکوۃ کتاب الفتن میں، (یہ روایت مشکوۃ کتاب الفتن میں باب الملاحم کی فصل ثانی میں ہے) حضرت نور اللہ مرقدہٗ بہت خوش ہوئے اور فرمایا مولانا سید سلیمان ندوی اس حدیث پر میرے معتقد ہو گئے، فرمایا: ''ایک مرتبہ سید صاحب تشریف لائے، انھوں نے یہ حدیث معلوم کی، میں نے کہا: ابوداود میں ہے، سید صاحب نے پوچھا کہ کہاں ہے؟ میں نے کہا: کتاب الملاحم میں، اور پھر کتاب منگوا کر دکھا بھی دی۔

**تزکیہ کی طرف عدم التفات :**

ابتداءً بالکل بچپن میں تو طبیعت کا رجحان تھا، لیکن بعد میں بعض وجوہات سے یہ خیال نکل گیا، اور یہی نہیں بلکہ کچھ اس کی اہمیت ہی نہیں رہی، حضرت عبدالحلیم صاحب مرحوم نے بعض خطوط میں ناراضگی کا اظہار بھی کیا اور لکھا: ''تزکیہ ضروری ہے''۔

لیکن اس وقت کتابوں کی طرف غیر معمولی رجحان تھا، ادھر بالکل التفات ہی نہیں، بلکہ ایک مرتبہ جب حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنے دارالتصنیف میں تشریف فرما تھے اور میں حسب معمول حاضر ہوا، تو تھوڑی دیر کے بعد سوال کیا، کیا بیعت ہونا ضروری ہے؟ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا: ''بالکل نہیں''۔

پھر ایک زمانہ گزر گیا، بہت سے لوگ بیعت کی طرف توجہ دلاتے تھے، جیسے مولانا منور حسین صاحب، مولانا عبدالجبار صاحب اور بعض اصرار کرتے تھے، جیسے صوفی انعام اللہ صاحب، مگر کچھ التفات ہی نہ تھا۔

**بیعت میں انقیاد ضروری:**

اچانک رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ کے عشرۂ اخیر میں خیال پیدا ہوا اور بہت زور سے، حضرت نور اللہ مرقدہ سے عرض کیا، حضرت نے فرمایا: ''بیعت میں انقیاد اور عدم تنقید ضروری ہے، استخارہ کر لے''۔

میں نے عرض کیا: حضرت! میں نے دعاء کی ہے، اس زمانہ میں اپنی دعا پر بڑا اعتماد تھا، مگر حضرت نے فرمایا کہ: ''استخارہ کم از کم تین مرتبہ، اور رات گزرنا اور سونا ضروری نہیں ہے''۔

**منامی بشارت :**

تیسرے استخارہ میں خواب دیکھا، مولانا اکرام صاحب فرما رہے ہیں کہ ''مدرسہ قدیم آجاؤ آباد ہو جائے گا''۔

ہمارا قیام اس زمانہ میں دارالطلبہ قدیم میں ہو چکا تھا، حضرت نے سن کر فرمایا: ''یہ خواب امید افزا ہے''۔

**خصوصی بیعت:**

ایک دن رمضان میں ظہر بعد اپنے خلوت خانہ میں طلب فرما کر بیعت فرمایا۔

میں نے اس سے پہلے عرض کیا تھا کہ حضرت! جب عمومی بیعت ہوتی ہے میں بھی سب کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا، مگر حضرت نور اللہ مرقدہ نے انکار فرمایا۔

ایک بات یہ بھی لکھ دوں کہ اس وقت بعض ایسے مشائخ کبار حیات تھے جن سے بندہ کو بہت عقیدت تھی، لیکن بیعت میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ ہی کی طرف طبعی رجحان تھا اور عقلاً بھی رجحان تھا، نیز یہ بھی کہ حضرت استاذ تھے اور پھر قریب بھی تھے۔

**قیمتی نصائح :**

ہروقت پاس رہنا تھا، اس لئے خط وکتابت تو ہوتی نہیں تھی، بعض اوقات یونہی بعض پرچے مدینہ طیبہ سے بھجوائے ان میں بعض نصائح لکھیں اور بعض اوقات زبانی نصائح کیں:

(۱) ایک گرامی نامہ میں لکھا: ''جہاں تک ہو سکے اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا اور ظاہر سے زیادہ باطن میں''۔

(۲) تیسرے سال بلڈ پریشر کی تکلیف پر تحریر فرمایا: ''ایک بات کا خیال رکھیو کہ اگر بیماری میں زبانی معمولات نہ ہوسکیں، تو قلب کو ضرور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھیو، اور زبانی معمولات میں درود شریف کو مقدم رکھیو، میں نے درود شریف کے بہت فوائد دیکھے ہیں''۔

(۳) اور یہ تو کئی مرتبہ نصیحت کی: ''کبر سے پورا اجتناب کرنا، اور اپنی نااہلی پیش نظر رہے، اگر کوئی کہے تو اس پر طبعی اثر غیر اختیاری چیز ہے، لیکن برا نہ ماننا چاہئے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلاً یہ خیال ہو کہ ہم تو بہت گندے ہیں، نہ معلوم کتنے عیوب ہیں، اس لئے عقلاً برا نہ مانے، واللہ اعلم۔

(۴) ایک خط میں نے لکھا تھا کہ ایک طالب علم بہت اصرار کرتا ہے کہ بیعت کرلو، حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے تحریر فرمایا: ''ضرور کرلو، سلسلہ چلانے کے لئے بیعت تو ضرور کرنا، مگر اپنی نااہلیت کا استحضار رہنا چاہئے، اگر نہ کروگے تو یہ سلسلہ بند ہوجائے گا، جو سلسلہ حضور ﷺ سے چلا آرہا ہے'' (یہ خط اسٹینگر جنوبی افریقہ سے لکھوایا تھا)۔

(۵) ایک خط میں لکھوایا تھا: ''مدرسہ کے مال میں بہت احتیاط کرنا''۔

(۶) مرکز نظام الدین دہلی میں جب حضرت نور اللہ مرقدہ سے ملاقات ہوئی، تو بالکل خلاف توقع معانقہ فرمایا، اور فرمایا کہ: ''اخلاص سے کام کرنا''۔

(۷) آخری خط جو ۱۲/اپریل ۸۲ء کا تحریر کردہ ہے، اس میں میرے ایک خط کے جواب میں لکھا، جس میں میں نے اپنے امراض کی شدت اور خواب میں اموات ومقابر دیکھنے کا تذکرہ کیا تھا، لکھا کہ: ''اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مجھے اور تم کو دونوں کو حسن خاتمہ کی دولت سے مالا مال کرے، ہر وقت اپنے عمل سے ڈرتے رہنا چاہئے، اگرچہ مالک کا کرم بڑا ہے، اس کے کرم ہی کا سہارا ہے، پھر بھی استغفار کثرت سے کرتے رہنا چاہئے''۔

**مقرباں را بیش بود حیرانی:**

بھائی! ہم تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے سب سے نالائق شاگرد اور ناکارہ وکم فہم مرید تھے، اور پھر مدرسہ کے متعلق معاملات پڑتے تھے، اس میں کثرت سے ڈانٹ پڑتی تھی اور پھر حضرت نور اللہ مرقدہٗ ویسے ہی ہوجاتے تھے جیسے پہلے۔

ہاں ایک آدھ مرتبہ بعض حضرات نے حضرت کو بہت ہی مکدر کردیا، لیکن معاملہ کسی اور ذات کے حوالہ تھا، اللہ تعالیٰ نے پھر صفائی کرادی ہے۔

اور ہمارا مزاج یہ تھا کہ فضول ہم کسی کام میں پڑتے نہیں، اس لئے جب اپنا کام بن جاتا تو پیچھے نہیں پڑتے تھے۔

ایک عجیب قصہ مجمل لکھتا ہوں، لکھنے کے لئے نہیں۔

بعض حضرات نے شکایت کرکے حضرت کو مکدر کردیا، حضرت ایک رمضان میں رنجیدہ رہے، رمضان تو گزر گیا، اس کے بعد ہم نے ایک پرچہ لکھا جس میں معافی مانگی اور یہ لکھ دیا کہ ''اگر کوئی کام ہو تو میرے حجرہ میں بھجوادیا جائے، مجھے سردی بہت لگتی ہے''۔

حضرت بہت خوش ہوئے اور کئی بار دعوت کی، اور رمضان شریف میں جن بعض حضرات نے فقرے کسے اور ستایا وہ آئے، اور شرمندہ ہوئے، ہم نے اپنے دل میں کہا کہ ہم حضرت کے شاگرد وخادم ہیں، آپ حضرات کو ان قصوں میں نہ پڑنا چاہئے، اس کے بعد سے وہ صاحب تو ہمیشہ کے لئے بحمد اللہ خاموش ہوگئے۔

**عطایا کی بارش:**

بارہا حضرت نے روپے دئے، ۸۴ھ کے حج میں جاتے ہوئے پچاس روپے دئے تھے، اس کی نصب الرایۃ خرید لی، حج سے آکر

پوچھا کہ: ''میں نے چلتے ہوئے تجھے روپے دیئے تھے کچھ تیرے کام آئے؟'' میں نے عرض کیا کہ میں نے نصب الرایہ خرید لی، تو فرمایا کہ: ''اس کے لئے تو عمر پڑی تھی''۔

مقصد یہ تھا کہ دوسری ضروریات میں خرچ کرتے، ''لامع الدراری'' کے ختم پر تین سو روپے دیئے، جس کی ہم نے ''مرقاۃ المفاتیح'' منگوائی، اور متفرق اوقات میں دیتے رہے، کبھی تیس، کبھی پچاس، اکثر پچاس، اور بذل المجہود مکمل، لامع الدراری مکمل، اُوجز المسالک مکمل، جزء حجۃ الوداع والعمرات اور مختلف رسائل دیئے، اور جب بندہ کی حاضری مدینہ طیبہ میں ہوئی تو فرمایا کہ ''میری کتابوں میں جو پسند ہو لے جا'' وہاں اس وقت اردو کتابیں تھیں، ایک کتاب ''اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیه الشیخان'' تھی، وہ ہم نے لے لی، حضرت نے اس کے بعد ایک کتاب بھجوائی ''أبو هريرة فی ضوء مرویاته''، تالیف ضیاء الرحمٰن الأعظمی، اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی دوسو روایتیں جمع کر کے اس کے طرق وغیرہ پر کلام کیا گیا ہے اور مستشرقین نے جو حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر شکوک وشبہات کئے ہیں ان کی تردید کی ہے، اور تصوف سے متعلق حضرت کی جتنی تالیفات ہیں، یا صوفی اقبال صاحب نے لکھی ہیں، تقریباً سبھی عطا فرمائیں، اور بعض تو بار بار بھجوائی۔

## ذکر کی تجویز میں توارد:

حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت تو ہوگیا، لیکن ذکر پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوتی، اپنے امراض کی وجہ سے یہ سمجھتا رہا کہ میرے بس سے باہر ہے اور نہ حضرت نے بیعت کے وقت کچھ فرمایا، ایک مرتبہ رمضان میں از خود اپنے لئے ایک نصاب مقرر کرلیا، یعنی تین تسبیح لا الہ الا اللہ کی اور پانچ تسبیحات اللہ اللہ کی، اس کے بعد جب چند روز بعد غالباً عشاء کے بعد حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا: ''ذکر کرلیا کرو'' اور مذکورہ بالا نصاب بتایا، بس میں تو سمجھتا ہوں کہ اعتکاف میں حضرت کے ساتھ تھا، حضرت کے مبارک قلب کا اثر پڑا، جو خود ایک نصاب مقرر کرلیا اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے وہی بتلایا، پھر معلوم ہوا کہ حضرت مشغول حضرات کو یہی نصاب بتاتے تھے۔

## معمولات میں اضافہ:

کچھ دنوں کے بعد حضرت کے بعض ارشادات کی بناء پر تھوڑا تھوڑا اسم ذات کا اضافہ شروع کیا، اور سترہ سو تک پہنچا دیا، لیکن حضرت نے کم کرنے کو فرمایا، اور فرمایا: اسم ذات ایک ہزار رکھو، یہی اب تک معمول ہے، پاسِ انفاس کا حکم بار بار دیا اور مراقبہ دعائیہ بھی بتایا، بس جیسے ہم ہیں ویسا ہی ہمارا ذکر، حضرت کے زمانہ میں اور اب بھی نفی واثبات واسم ذات کا تو معمول ہے، الا یہ کہ مرض یا کوئی شدید مانع ہو باقی اور چیزیں کبھی ہوگئیں کبھی نہیں۔

ایک مرتبہ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا، جبکہ میں بہت بیمار ہوگیا تھا کہ: ''دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہے'' یہ بھی لکھ دوں کہ زیادہ مجاہدہ میرے بس کا نہیں تھا، اور نہ ہے، ایک مرتبہ رمضان شریف میں حضرت سے عرض کیا کہ: ''حضرت! یہ رات بھر کی بیداری میرے بس کی نہیں'' تو فرمایا: ''سب کو اس کی ضرورت نہیں''۔

ایک مرتبہ اعتکاف میں خواب دیکھا کہ حضرت لوگوں کو کچھ تقسیم فرمارہے ہیں، میں اگلے روز حاضر ہوا، خواب عرض کیا، اور عرض کیا: ''حضرت! اگر بیداری کرنے والوں کو ملے گا تو ہم محروم ہوجائیں گے'' حضرت نے فرمایا: ''نہیں انشاء اللہ''، ایک مرتبہ اعتکاف میں بہت بیمار ہوگیا، اس زمانہ میں کچھ ذکر وغیرہ نہیں کرتا تھا، حضرت نے غالباً بھائی ابوالحسن صاحب یا کسی اور سے کہلوایا کہ: ''اگر اختیاری مجاہدہ نہیں کرتے تو اضطراری کرایا جاتا ہے'' مگر ہم نے اپنی نالائقی سے کوئی اثر نہیں لیا۔

## ناظم صاحبؒ کی طرف سے خلافت:

حضرت اقدس مولانا اسعد اللہ صاحب (سابق ناظم اعلی مدرسہ مظاہر علوم) نور اللہ مرقدہ نے بروز پنجشنبہ ۵/محرم الحرام ۱۳۹۶ھ میں ظہر کے بعد اجازت مرحمت فرمائی، جس کا از خود شہرہ

ہوگیا، چونکہ احقر کا بیعت کا تعلق حضرت قطب العالم شیخ الحدیث کاندھلوی ثم المہاجر المدنی نوراللہ مرقدہ سے تھا، اس لئے حضرت ناظم صاحب کی اجازت کے بعد بھی اپنے حضرت نوراللہ مرقدہٗ سے ہی تربیت کا تعلق رہا، اور بحمداللہ بالکل کبھی اجازت کا کوئی خیال بھی نہیں آتا تھا، گو اہل اللہ کے ارشاد کی دل میں قدر تھی اور ہے۔

## حضرتؒ کی طرف سے اجازت:

پھر جب حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ رمضان شریف کے لئے مدینہ منورہ سے سہارنپور تشریف لائے تو حسبِ معمول اعتکاف کیا، اور رمضان کے بعد شوال میں مجلس شریف میں حسب معمول حاضری ہوتی رہی، غالبًا ۵/ذی قعدہ تھی، بروز پنجشنبہ صبح کی مجلسِ ذکر میں حاضر ہوا تو حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے ذکر سے فراغت کے بعد بلوایا، اور فرمایا کہ: ''تو جمعہ کے دن حاجی شاہ جاتا ہے؟'' (حاجی شاہ سہارنپور کا مشہور قبرستان ہے)، عرض کیا حضرت! مجھ کو سردی بہت لگتی ہے، حضرت نے فرمایا کہ: ''یہاں آ'' اور چارپائی پر بیٹھنے کے لئے فرمایا، اور فرمایا کہ: ''میرا ارادہ تین چار سال سے تجھے اجازت دینے کا ہے، لیکن تیرے اندر تکبر ہے''، میں خاموش رہا اور الحمدللہ حضرت کے کہنے پر طبیعت پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت والا کو حضرت ناظم صاحب کی اجازت کا علم ہوگیا ہوگا؟ فرمایا کہ ''ہاں'' میں نے عرض کیا: حضرت میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ حضرت ناظم صاحب نے کیوں اجازت دی؟ حضرتؒ نے اس پر کیا ارشاد فرمایا یاد نہیں رہا، پھر فرمایا کہ: ''تجھے میری طرف سے اجازت ہے''۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ دن پیشتر ایک عجیب حالت طاری ہوئی تھی، جیسے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوں اور نماز سے فراغت پر نقص ہی نقص نظر آتا تھا اور اسی وقت نماز کے بعد استغفار پڑھنے کی حقیقت سمجھ میں آئی، اور ایسا ہوگیا تھا کہ اگر کوئی مجھے چارپائی کے سرہانے بیٹھنے کو کہتا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے، اور ایک مرتبہ ایک جگہ لوگوں نے امامت کے لئے کہہ دیا تو آنسو آگئے، لیکن نادانی سے ایک جملہ کہنے پر ساری حالت جاتی رہی، میں نے کہہ دیا کہ: 'جب آدمی ذکر پر مداومت کرتا ہے تو اس کو ہمہ وقت ایک معیت حاصل ہوجاتی ہے اور اپنی نااہلی کا ہر وقت استحضار ہوجاتا ہے''، اس میں عجب نفس شامل تھا، بس ساری حالت کافور ہوگئی۔

حضرتؒ نے فرمایا: ''انشاءاللہ تعالیٰ پھر حاصل ہوجائے گی''، اب تک تو حاصل نہیں ہوئی، لیکن حضرت کی برکت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ناکارہ روسیاہ پر نظر کرم فرماویں، اور دوام حضوری عطا فرمائیں، اس کے بعد حضرت کے یہاں کچھ مہمان آگئے، حضرت نے فرمایا: ''ان کے ساتھ بیٹھ جا''، ناشتہ سے فراغت کے بعد واپس ہوئے تو مدرسہ قدیم کے دروازہ پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوا جیسے سینے میں کوئی چیز داخل ہوگئی، اس کی تعبیر الفاظ میں نہیں ہوسکتی، اور دل میں ذکر کا ایک شدید شوق پیدا ہوگیا اس کے بعد۔

## خواب میں حضرت مدنیؒ کی زیارت:

ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ حضرتؒ معتکف میں ہیں اور حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ بھی تشریف فرما ہیں، حضرت مدنیؒ کا مصلیٰ بچھا ہوا ہے، میں اس پر آکر کھڑا ہوگیا، حضرت سے اگلے سال عرض کیا: تو ایک مصلیٰ عنایت فرمایا۔

میں تو ہمیشہ سہارنپور ہی رہتا تھا، ہاں جب پاکستان حاضری ہوئی تو فرمایا: ''اپنی جگہ کام کرنا چاہئے تھا''۔

## مصادر ومراجع:

(۱) الیواقیت الغالیہ (اکثر حصہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے)
(۲) خودنوشت: الیواقیت الغالیہ ہی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

☆☆☆

# تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

**نام کتاب:** حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (مشاہدات وتاثرات)

**مرتب:** طلحہ نعمت ندوی

**صفحات:** ۳۶۸

**طبع اول:** ۲۰۱۶

**ناشر:** علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، بہار

سید الطائفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کا نام نامی آتا ہے تو ندوۃ العلماء کا تابناک ماضی، دارالمصنفین کی عظمت رفتہ نظروں کے سامنے آجاتی ہے، صحیح تو کہا ہے مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے ''وہ نام بزم سلیمانی جس نے تحقیق ونظر کا کام کیا'' سید صاحبؒ کی شخصیت مختلف الجہات تھی، وہ ایک محقق عالم دین تھے، اجتہاد کے مرتبہ تک پہنچے ہوئے تھے، درجۂ استناد پر فائز تھے، صاحب نسبت وارشاد بزرگ تھے، محقق مفسر وفقیہ ومورخ وسیرت نگار اور قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی صحافت کی چشم وابرو بھی درست کی، ان کے باکمال استاد علامہ شبلی کا آخری مرکز آرزو دارالمصنفین سید صاحب اور دیگر اصحاف باصفا کی یادگار ہے، معارف کا دوام وتسلسل سید والا گہر کے خلوص کی قوی دلیل ہے۔

ان ساری خصوصیات وکمالات کے باوجود جو چیز سید صاحب کو ممتاز کرتی ہے وہ جامعیت ہے، یہ وہ وصف ہے جو اس دنیائے رنگا رنگ میں مشکل سے کسی کو ہاتھ آتا ہے، اور جسے مل جائے تو وہ محبوب خلائق بن جاتا ہے۔

سید صاحب ان ہی لوگوں میں تھے جن کی شخصیت مختلف الجہات اور جامع الکمالات تھی، گویا مذہبیات وسیاسیات پر یکساں نظر رکھتے، دین وادب کو باہم آمیز کردیتے، تحقیق کی خشکی کو اسلوب کی لطافت سے دور کردیتے، تعلیم وتزکیہ کی یکجائی کا درس دیتے، عقل ودل دونوں کو فتح کرنے، دونوں پر قابو پانے اور دونوں پر حکمرانی کرنے کی مثال آپ سے بہتر اور کہاں۔

سید صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں، لیکن ہم سے پوچھیے تو ہم یہی کہیں گے کہ ان پر جس قدر کام ہونا چاہیے تھا وہ ابھی نہیں ہوا، ان سے تعلق رکھنے والے اداروں کو جس قدر نظر التفات ان کے خلوص وخدمات و تحقیقات پر کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کی گئی، عزیز القدر برادرم طلحہ نعمت ندوی قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے وطنی نسبت و تعلق سے مغلوب ہوکر ہی صحیح مگر سید صاحب کی ذات والا صفات کو موضوع بنایا اور مختلف حیثیتوں سے ان پر کام کررہے ہیں، ان سے پہلے ندوۃ العلماء کے ایک اور فاضل اور لائق و فائق فرزند مولانا رحمت اللہ ندوی (مقیم قطر) نے سید صاحب پر عربی میں کتاب مرتب کی، ان کی شہرۂ آفاق اور خالص علمی

اور منفرد نوعیت کی کتب کو عربی میں منتقل کرنا شروع کیا اور بحمد للہ ان کا یہ سفر جاری ہے۔

سید صاحب پر جو کچھ میری نظر سے گزرا ان میں مولانا عمران خاں صاحبؒ کی کاوشوں سے ہوئے سیمینار کا مجموعۂ مقالات ''نقوش سلیمانی''، بہت قیمتی ہے، لیکن زیر نظر کتاب بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ وہ مجموعہ اگر علمی جہات کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو یہ کتاب سوانحی تفصیلات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ان کی علمی ومطالعاتی زندگی پر بھی محیط ہے۔

اس کتاب میں مرتب نے متعدد اصحابِ قلم کے مطبوعہ مضامین کو مختلف کتب ورسائل سے اخذ کر کے یکجا کر دیا ہے، انھوں نے ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے اور اس میں صحیح لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں بعض وہ مضامین بھی آ گئے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے، واقعہ ہے کہ اس مجموعہ میں بعض وہ مضامین ہیں جن سے اس دور کے بہت سے طلبہ اور نوجوان علماء واقف بھی نہ تھے، مجموعہ کی ابتدا میں دو مضامین خود حضرت سید صاحب کے ہیں: ''میری تعلیم ومطالعہ'' اور ''جن سے میں متاثر ہوا''، پھر ۳۳ مضامین ومقالات اور ہیں، جن میں ایک جانب سید صاحب کا سوانحی خاکہ موجود ہے، وطن کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالی گئی ہے، تعلیم ومطالعہ اور خاندانی تفصیلات کا علم ہوتا ہے، تو دوسری طرف یہ مضامین سید صاحب کے علمی کمالات، تحقیقی فتوحات، قرآنی بصیرت، تنقیدی رجحان اور شخصی عظمت کے معترف وامین ہیں، ان میں خوردوں کے تاثرات واحسان مندی کا اظہار بھی ہے اور معاصرین کا اعتراف عظمت وجلالت بھی، متاخرین کی حسرتیں بھی ہیں اور اساتذہ کی ستائشیں بھی، فہرست پر نظر ڈالیے تو باکمال اہل علم کی کہکشاں نظر آتی ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے لے کر مفتی محمد شفیعؒ تک، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے لے کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تک ایسے اصحاب نظر کے مقالات اس مجموعہ کی زینت ہیں جن کی یکجائی مختلف رنگ کے پھولوں سے سجے گلدستہ سے کم نہیں۔

بظاہر یہ کوئی بہت بڑا علمی کارنامہ نہیں، لیکن فی الحقیقت بہ لحاظ ضرورت برادر مکرم طلحہ نعمت نے یہ بہت اچھا اور قابل قدر ومفید کام کیا ہے، اس مجموعہ میں سید صاحب کی شخصیت وسوانح اور علمی قدر ومنزلت کی تفصیلات جمع ہیں، ساتھ ہی ندوۃ العلماء کے عہد ماضی اور اس ماحول کا عکس بھی اتر آیا ہے جس ماحول میں سید الطائفہ، مولانا عبدالباری، شبلی متکلم اسلام، مسعود عالم ندوی، ابوالحسن علی ندوی، جیسی یکانۂ روزگار شخصیت سے دامن ہند مالا مال ہوا، ان میں سے بعض مضامین کے حصول میں مرتب نے جو عرق ریزی کی اللہ ان کو اس کے لیے بہترین جزا دے، یقیناً یہ کتاب ہمارے کتب خانوں کے لیے ایک گراں قدر اضافہ اور باذوق اہل علم کے لیے ایک تحفہ ہے، اسے ایک علمی سوغات سمجھ کر خریدنا چاہیے، پڑھنا چاہیے، اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی فکر کو جلا بخشنا چاہیے، ذہن کو منور کرنا چاہیے اور مستقبل کے لیے علمی خاکے مرتب کرنا چاہیے، اس کتاب کا مطالعہ واقعی شوق علم ومطالعہ کو مہمیز کرنے کا کام کرتا ہے، ساتھ ہی ''اخلاص'' کا ایک پیکر تراش کر نظروں کے سامنے کر دیتا ہے۔

.....

**نام کتاب: حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ**
**مصنف: سید صباح الدین عبدالرحمٰن**
**مرتب: طلحہ نعمت ندوی**
**صفحات: ۳۸۴**
**طبع اول: ۲۰۱۶ء**
**ناشر: علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، بہار**

معروف انشاء پرداز و مورخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن علامہ سید سلیمان ندوی کے ہونہار شاگرد اور فاضل صاحب قلم تھے، ان کو اپنے استاد سے ویسا ہی عشق تھا جیسا ان کے استاد کو اپنے استاد علامہ شبلیؒ سے تھا، سید صاحب کی وفات پر جس طرح انھوں نے نثر میں نوحہ خوانی کی ہے، آج بھی اس کو پڑھتے ہوئے کوئی سخت دل وسخت جان مشکل سے اپنی آنکھوں پر قابو رکھ پائے گا۔

صباح الدین صاحب سید صاحب کے تراشے ہوئے تھے، ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، ان کے عزیز تو تھے ہی، ان کو ذات سید اور تصنیفات سید سے عشق تھا، مگر ان کی تحریریں مبالغہ آرائیوں اور ہر طرح کی عصبیت سے پاک ہیں، صباح الدین صاحب نے اپنے استاد پر بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، تاثراتی مضامین کے علاوہ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سید صاحب کی کتب کا عالمانہ جائزہ لیا اور ناقدانہ نظر سے مبسوط تبصرے کیے ہیں، ان کی کتاب ''مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ'' احسان شناسی کے ساتھ ان کی عالمانہ شان کی بھی دلیل ہے، اگر اس کی دوسری جلد بھی آجاتی تو یہ موضوع مکمل ہوجاتا مگر موت سے کس کو رستگاری ہے، راہ وفا کا یہ شیدائی بھی اپنا کام جو مقدر تھا مکمل کر کے رخصت ہوگیا، لیکن استاد کی خدمت احسان شناسی اور فرض کی ادائیگی، سادگی اور ایثار وقربانی کے نقوش چھوڑ گیا، آج دارالمصنفین کے سرمایہ افتخار میں اس کے اہداف کے مطابق صباح الدین صاحب کا حصہ کسی سے کم نہیں، ان کی خدمات وتصنیفات از خود ایک پی ایچ ڈی کا موضوع ہیں، ان کا اسلوب نگارش، طرز استدلال سب دبستان شبلی کا فیض وترجمان ہے۔

زیر نظر کتاب میں مرتب نے بعض غیر مطبوعہ مضامین اور بعض مختلف رسائل کی فائلوں میں دب چکے مضامین کو یکجا کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے، اس طرح صباح الدین صاحب نے استاد محترم اور ان کی تصنیفات سے متعلق متفرق طور پر جو کچھ لکھا وہ یکجا کر دیا گیا، ابتدا میں مرتب نے ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے، جس سے مضامین کی اہمیت اور پس منظر سے واقفیت ہوتی ہے، اس طرح کتاب کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے، یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہر ہر مضمون پر علیحدہ تبصرہ کیا جائے، اگر چہ یہ خدمت مقدمہ کتاب میں انجام دی گئی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ کتاب بحیثیت مجموعی ہمارے علمی خزانے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، کیا خوب ہوتا کہ اس کی اشاعت دارالمصنفین سے ہوتی، یہ کتاب فرصت سے مطالعہ کرنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہے، اس کی افادیت متنوع اور اس کی سطر سطر پر از معلومات ہے، اللہ تعالیٰ مرتب، مصنف اور ممدوح مکرم سید صاحبؒ سبھی کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

# دینی مدارس سے بے توجہی کی بنیادی وجہ

(م۔ق۔ن)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں ایک پریشان حال خاتون حاضر ہوئی اور اپنی مشکل بتا کر تعویذ کی درخواست کی، حضرت تھانویؒ کا چونکہ ایسے لوگوں کو شرکیہ ٹوٹکے اور ٹونوں سے بچانے کے لئے کچھ قرآنی آیات لکھ کر دینے کا معمول تھا، تعویذ دے دیا، تعویذ کو چٹکی میں پکڑ کر وہ لے چلی، وہ چٹکی سے گر گیا، آگے چلی تو دروازہ پر دوبارہ گر گیا، وہاں سے اٹھایا تو سیڑھیوں پر گر گیا، حضرت نے دیکھا، تو اس کو بلایا اور فرمایا اچھا والا تعویذ دے دوں، چار آنے کا ملے گا؟ وہ بولی حضرت چاہے آٹھ آنے یا روپیہ کا ہو، مگر تعویذ اچھا والا ہی دیجئے، حضرت نے وہ تعویذ لے لیا اور دوسرا لکھ کر دے دیا، چار آنے لے کر ایک خادم کو دے دئے کہ جب واپس آئے تو اسے دے دینا، اور اس سے کہا کہ کام ہو جائے تو یہ تعویذ واپس کر جانا، چار آنے دے کر خاتون نے وہ تعویذ لیا، اور دوپٹہ کے پلو میں بڑی قدر سے لپیٹا اور گرہ لگائی، اور گرہ کو سینہ سے لگا کر قدر سے لے کر چلی۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا: اب اس کے پیسے خرچ ہو گئے تو اس تعویذ کی قدر پیدا ہو گئی، اب اس کو فائدہ بھی ہوگا، قدر و منزلت نہ ہو تو فائدہ بھی نہیں ہوتا، انسان کی فطرت میں یہ بات اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے کہ جب کسی چیز پر اس کی جان و مال اور وقت لگتا ہے، تو اس کی قدر و منزلت دل میں پیدا ہوتی ہے، اور یہ بات اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے کہ جس چیز کی دل میں قدر و منزلت ہوتی ہے، اس پر انسان جان و مال اور دولت سب کچھ خرچ کرتا ہے۔

آج مدارس اسلامیہ کی قدر و منزلت جو لوگوں کے دلوں سے ختم ہو گئی ہے اور ان مدارس کی اہمیت و وقعت ان کے دلوں میں نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کا مال و دولت مدارس اسلامیہ میں صرف نہیں ہو رہا ہے، اس لئے ان کی اہمیت ان کی نظروں میں نہیں ہے؛ لیکن جو لوگ مدارس اسلامیہ میں اپنی رقوم زکوۃ، صدقہ، امداد اور عطیہ کی صورت میں خرچ کرتے ہیں، مدارسِ اسلامیہ میں جا کر وہاں کے نظامِ تعلیم و تربیت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور قریب سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، آج ان کے دلوں میں ان مدارس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

وہ دینی مدارس کو اس ملک میں مسلمانوں کے ملی تشخص و بقا کی علامت اور ان کی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے وجود سے ہمارا وجود و بقا متعلق ہے۔ اور ان کے دم سے ہماری زندگی میں بہار ہے۔

لیکن ایک بڑا طبقہ بلکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دینی اداروں، مدارس اور علماء مدارس اور خدام مدارس سے حد درجہ استخفاف بلکہ اہانت کا رویہ رکھتے ہیں۔

ایک موقع پر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ایک خادم خاص حضرت صوفی انیس صاحبؒ نے حضرت والا سے ایک بار عرض کیا کہ حضرت اپنے شیخ سے استفادہ کی بنیادی کلید کیا ہے؟

حضرت والا نے جواب دیا کہ کسی بھی دینی ذریعے سے مسجد، کتاب، قرآن و حدیث، استاذ، شیخ سے استفادہ کی بنیادی کلید ہے عظمت۔ سوال کیا کہ سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟ حضرت نے جواب دیا استخفاف یعنی اہانت اور ہلکا سمجھنا، کیا ہوا شیخ ہی تو ہے، ایک بشر ہی تو ہے، مولوی ہی تو ہے، کتاب ہی تو ہے۔ افسوس ہے کہ دینی مدارس اور علماء مدارس اور خدام مدارس کے سلسلے میں امت میں حد درجہ استخفاف بلکہ اہانت کا معاملہ پایا جاتا ہے۔

☆☆☆